نئے ادب کے معمار

دیوندر ستیارتھی

از

ساحر لدھیانوی

کتب پبلشرز لمیٹڈ
بمبئی

سنہ ۱۹۴۸ء

قیمت

پندرہ آنے

فیروز مستری نے قادری پریس محمد علی روڈ بمبئی ۳ سے چھپوا کر
کتب پبلشرز لمیٹڈ ۱۷ گن باؤ اسٹریٹ بمبئی ۱ سے شائع کیا

دیوندر ستیارتھی

انتخاب

دیوندر ستیارتھی

ساحر لدھیانوی

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اس روز دن بھر بارش ہوتی رہی۔ شام کے وقت بوندیں ذرا تھم گئی تھیں۔ لیکن مطلع ابھی تک ابر آلود تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی مینہہ پھر برسنے لگے گا۔ میں اور گوپال متّل مکتبۂ اردو سے برانڈرتھ روڈ کی طرف جا رہے تھے۔ انارکلی کے چوک پر کسی نے متّل کا نام لے کر آواز دی۔ ہم نے مڑکر دیکھا، بائیں ہاتھ ملّاں حسین حلوائی کی دوکان کے سامنے ایک سِکھ نوجوان ہمیں بلا رہا تھا۔ یہ نوجوان راجندر سنگھ بیدی تھا۔ جسے میں ایک بار پہلے حلقۂ ارباب ذوق کے اجلاس میں دیکھ چکا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص تھا لمبے لمبے بال، لمبی اور گھنی داڑھی، میلا اور لمبا اوورکوٹ،

"آؤ، تمہیں ایک بہت بڑے فراڈ سے ملائیں"۔ گوپال متّل نے کہا

"کس سے" میں نے پوچھا

"دیوندر ستیارتھی سے" اس نے جواب دیا

دیوندر ستیارتھی اس وقت گاجر کا حلوہ کھانے میں محو تھا اس لئے جب گوپال متل نے میرا تعارف کرایا، تو اس نے کوئی خاص توجہ نہیں دی میں ان دنوں دیال سنگھ کالج لاہور میں بی۔ اے کا طالب علم تھا اور نیا نیا لدھیانہ سے لاہور آیا تھا۔ ادیبوں سے میری واقفیت کم تھی۔

ستیارتھی نے حلوے کی پلیٹ ختم کرنے کے بعد بیدی کی طرف دیکھا اور کہا

"بڑی مزیدار چیز ہے دوست! ایک پلیٹ اور نہیں لے دو گے؟"

بیدی اس وقت گوپال متل سے ایک ادبی مسئلے پر باتیں کر رہا تھا،

"لے لو" اس نے جلدی سے کہا۔

"لیکن کیسے؟" ستیارتھی بولا۔ "تم پیسے دو تب نا؟"

"اوہ" بیدی نے ذرا چونکتے ہوئے کہا، اور حلوائی کو پیسے ادا کر کے حلوے کی دوسری پلیٹ دیوندر ستیارتھی کے ہاتھ میں تھما دی۔

ستیارتھی پھر حلوہ کھانے میں محو ہو گیا۔

بیدی اور متل باتیں کرنے لگے،

میں خاموش ایک طرف کھڑا رہا۔

حلوے کی دوسری پلیٹ ختم کرنے کے بعد ستیارتھی نے اپنی جیب سے ایک میلا خاکی رومال نکال کر ہاتھ پونچھے، پاس پڑی ہوئی ٹین کی کرسی پر سے اپنا کیمرہ اور چرمی تھیلا اٹھایا اور گوپال متل کی طرف بڑھتے ہوئے بولا،

"یار متل! ایک خوشخبری سنو گے؟"

"کیا" - اس نے کہا
"میں ترقی پسند ہو گیا ہوں"
"کب سے ؟" متل نے مسکراتے ہوئے پوچھا
"تھا تو شروع ہی سے، لیکن یہ افسانہ جو میں نے ابھی ابھی لکھا ہے اس کے بعد تو سو فی صدی ہو گیا ہوں۔"
"ہوں —— تو گویا تم نے پھر ایک افسانہ لکھا ہے"
"لیکن اس افسانے اور میرے پچھلے افسانوں میں فرق ہے۔ یہ افسانہ میں نے خالص ترقی پسندی کے اصولوں کو سامنے رکھکر لکھا ہے" ستیارتھی نے کہا، اور پھر بیدی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا،
"اچھا تو یار بیدی! اب تم چلو، میں ذرا گوپال متل کو کہانی سنالوں"
"اور بیدی کو کیوں نہیں؟" —— گوپال متل نے بڑی بے بسی کے ساتھ بیدی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"میں یہ کہانی دو بار سن چکا ہوں" —— بیدی مسکرایا ——
"اس کے علاوہ مجھے ابھی ابھی ریڈیو سٹیشن پہنچنا ہے۔ شام کی خبروں کے بعد میری ٹاک ہے"
"ہاں ہاں، آپ جائیے۔ ستیارتھی نے بیدی کو رخصت کرتے ہوئے کہا۔ بیدی چلا گیا۔
میں اور گوپال متل ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ستیارتھی نے اپنے چرمی تھیلے میں سے کاغذات کا ایک پلندہ نکالا اور صفحے الٹتے ہوئے بولا

"تو فر دیھر، کہاں بیٹھیں؟"

"اب تم خود ہی بتاؤ"

"میرا خیال ہے، سامنے کے لان میں ٹھیک رہے گا"

"لیکن لان میں تو بارش کی وجہ سے پانی جمع ہو گیا ہے"

"اوہ مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ تو فر تم یوں کرو، تھوڑی دور میرے ساتھ چلو، یہاں سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر سینلا مندر ہے۔ وہاں اطمینان سے بیٹھ سکیں گے"

سینلا مندر کا فرش یاتریوں کی آمدورفت سے کیچڑ میں لت پت ہو رہا تھا، اور اس کیچڑ میں بڑے بڑے مکوڑے کلبلا رہے تھے منتل نے دیوندر ستیارتھی کی طرف گھور کر دیکھا، اور پوچھا۔

"تم افسانہ ضرور سناؤ گے؟"

"ہاں دوست! تم نہیں سنو گے، تو مجھے بڑا دکھ ہوگا" ستیارتھی نے بڑی لجاجت سے کہا —"میں تمہاری رائے لینا چاہتا ہوں"

"اچھا تو ایک منٹ انتظار کرو" منتل نے کہا، اور مندر سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک تانگہ مندر کے دروازے کے باہر آ کر رکا، اور گوپال منتل نے اس تانگے میں سے گردن نکال کر ہمیں پکارا۔ ہم دونوں جا کر تانگے میں بیٹھ گئے، تانگہ چلنے لگا، راستہ بھر گوپال منتل نے کوئی بات نہیں کی، ستیارتھی بھی خاموش بیٹھا رہا۔ تانگہ انڈیا کافی ہاؤس کے سامنے جا کر رک گیا

"چلو" گوپال متل نے ستیارتھی سے کہا۔

"کہاں؟ کافی ہاؤس میں!" ——— ستیارتھی کا چہرہ جیسے ایک دم کھل اٹھا۔

"ہاں ——— چلو اترو۔"

"یار متل! تم واقعی کمیونسٹ ہو، اب تو مجھے بھی یقین آگیا ہے، کہ سوویت روس میں ادیبوں اور آرٹسٹوں کا خاص خیال رکھا جاتا ہوگا۔"

ستیارتھی پھر مسکرایا اور کافی ہاؤس کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مسودے کے صفحے الٹنے لگا،

یہ میری اس سے پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد وہ مجھے کئی بار ملا کبھی کسی جنرل مرچنٹ کی دوکان کے سامنے۔ کبھی کسی ڈاکخانے کے گیٹ پر۔ کبھی کسی کتابوں کی دکان میں، کبھی میکلوڈ اور نسبت روڈ کے چائے خانوں میں اور کبھی یوں ہی سرراہے، ہر بار وہ میرے قریب آکر مجھ سے پوچھتا ——— "کہیے آپ کا مزاج کیسا ہے؟ اس وقت کدھر سے آرہے تھے؟ کہاں جایئے گا؟ آپ نے کوئی نئی نظم لکھی؟" ——— اور جب میں چلنے لگتا، تو وہ مجھے روک کر کہتا ——— "معاف کیجیے، مجھے آپ کا نام یاد نہیں رہا۔"

میں اسے پھر سے اپنا نام بتا دیتا۔

"ہاں ہاں ہاں" وہ کہتا، اور پھر جھومتا ہوا ایک طرف کو چلا جاتا۔ اسی طرح کوئی دو مہینے گزر گئے، آہستہ آہستہ مجھے یقین ہونے لگا، کہ یہ شخص کبھی مجھ سے کوئی نیا سوال نہیں پوچھے گا، اور کبھی اس کو میرا نام یاد نہیں ہوگا۔

ایک شام میں اپنے دوست کے ساتھ نسبت روڈ سے گذر رہا تھا کہ سامنے سے ستیارتھی آتا دکھائی دیا،

"ہیلو، ہیلو، آپ کا مزاج کیسا ہے؟" اس نے پوچھا

"آپ کی عنایت ہے" میں نے جواب دیا۔ "اس وقت لا رکالج ہوسٹل سے آ رہا ہوں۔ یہ میرے دوست رام پرکاش اشک ہیں۔ ہم دونوں سنیما دیکھنے جا رہے ہیں۔ میں نے کوئی نظم نہیں لکھی، میرا نام ساحر لدھیانوی ہے۔ کہئے آپ سنیما دیکھنے چلیں گے؟"

"نہیں" ستیارتھی نے جواب دیا، اس کے لہجے کی ملائمت اور بے نیازی بدستور قائم تھی، میں نے دیکھا، اس کا چہرہ ایک دم افسردہ ہو گیا تھا، مجھے اپنے انداز گفتگو پر افسوس ہونے لگا، اس انتقامی جذبے کے باوجود جو اپنے کو مسلسل نظر انداز کئے جانے کے احساس سے میرے دل میں پیدا ہو گیا تھا، میں ستیارتھی کی عزت کرتا تھا کیونکہ وہ "میں ہوں خانہ بدوش" کا مصنف تھا، اور اس نے گاؤں گاؤں گھوم کر ہندستان کی مختلف زبانوں کے اڑھائی لاکھ سے زائد گیت جمع کئے تھے جن سے میں نے ہندستان کی تہذیب، آرٹ اور کلچر کے بارے میں بہت کچھ سیکھا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اس سے معافی مانگ لینی چاہئے۔

لیکن وہ اس وقت جا چکا تھا۔

پھر بہت دنوں تک میری اور اس کی ملاقات نہیں ہوئی، اس کے بعد جب وہ مجھے لاہور کے ایک مشہور ناشر کی دوکان پر ملا۔ تو اسے میرا نام یاد تھا،

ناشر کی دکان پر وہ ناشر سے معافی مانگنے کے لئے آیا تھا، کچھ روز قبل اس نے "اگلے طوفان نوح تک" کے عنوان سے، حلقۂ ارباب ذوق کے ہفتہ وار اجلاس میں اس ناشر کے خلاف ایک کہانی پڑھی تھی۔ جس پر ناشر بے حد خفا تھا لیکن جب ستیارتھی نے اسے بتایا کہ وہ یہ افسانہ اس کے رسالے میں بغیر معاوضہ لئے دینے کو تیار ہے تو ناشر نے اسے معاف کر دیا اور اسے اپنے ساتھ نظام ہوٹل میں چائے پلانے لے گیا۔ میں اور فکر تونسوی بھی ساتھ تھے، راستے میں دیوندر ستیارتھی ناشر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چلنے لگا اور بولا۔

"چودھری! تمہارا رسالہ اس جن کے پیٹ کی طرح ہے جو ایک بستی میں گھس آیا تھا اور اس وقت تک بستی سے باہر جانے پر رضامند نہیں ہوا تھا جب تک وہاں کے لوگوں نے اسے یہ یقین نہیں دلا دیا کہ وہ ہر روز گپھا میں ایک آدمی بطور نذرانہ بھیجتے رہیں گے ——— تم بھی ویسے ہی ایک جن ہو اور تمہارا رسالہ تمہارا پیٹ ہے۔ ہم بیچارے ادیب اور شاعر ہر مہینے اس کے لئے غذا مہیا کرتے ہیں لیکن اس کی بھوک مٹنے میں نہیں آتی" ——— "اور یہ فکر تونسوی!" اس نے فکر کی طرف مڑتے ہوئے کہا ——— "یہ تمہارا گماشتہ ہے اجو ہر وقت ہمیں دھمکاتا رہتا ہے، کہ اگر جن کا راشن پہنچنے میں دیر ہوئی تو جن تمہاری کتابیں، تمہارے مسودے، تمہاری رائلٹی سب کھا جائے گا، کچھ باقی نہیں چھوڑے گا"

ناشر خاموش سنتا رہا،

"اب مجھی کو دیکھو" ستیارتھی پھر بولا۔ "میں نے تمہاری خفگی سے ڈر کر تمہیں بلا معاوضہ افسانہ دینا منظور کر لیا، لیکن تمہی بتاؤ، کیا میرا جی نہیں چاہتا

کہ میں صاف اور ستھرے کپڑے پہنوں، میرے جوتے تمہارے جوتوں کی طرح قیمتی اور چمکیلے ہوں۔ میری بیوی اپنے جسم پر ریشمی ساری پہنے، اور میری بچی تمہاری بچی کی طرح تانگے میں سکول جائے۔ لیکن کوئی میرے جذبات کا خیال نہیں کرتا۔ کوئی مجھے میری کہانی کا معاوضہ بیس روپے سے زیادہ نہیں دیتا، اور تم ہو کہ وہ بیس روپے بھی ہضم کر جاتے ہو۔ خیر، تمہاری مرضی، چائے پلائے دیتے ہو، یہی بہت ہے۔"

ناشر پھر بھی خاموش سنتا رہا،

ہم لوگ ہوٹل کے گیٹ میں داخل ہو گئے۔ ستیارتھی نے ناشر کے کندھے سے ہاتھ اٹھا لیا اور الگ ہو کر چلنے لگا،

میں اسی روز شام کی گاڑی سے لائل پور جا رہا تھا۔ ہوٹل میں پہونچ کر ناشر نے مجھ سے پوچھا،

"آپ واپس کب آئیں گے؟"

"دو تین روز میں" میں نے جواب دیا۔

"تم کہیں باہر جا رہے ہو؟" ستیارتھی نے پوچھا،

"ہاں، دو ایک روز کے لئے لائل پور جا رہا ہوں" میں نے جواب دیا،

"لائل پور؟" وہ بولا۔ اور پھر نہ جانے کس سوچ میں پڑ گیا۔ "اگر میں تمہیں اپنا کیمرہ دے دوں، تو تم میرے لئے کسانوں کے جھومر ناچ کی تصویر اتار لاؤ گے؟" اس نے تھوڑی دیر کے بعد پوچھا،

"میرے لئے تو یہ بہت مشکل ہے" میں نے کہا۔ "تم خود کیوں

نہیں چلتے ؟"

"میں ؟ — میرا جی تو بہت چاہتا ہے" وہ بولا — "لیکن ......"
وہ ایک منٹ رکا، اور پھر تھیلے سے کاغذوں کا ایک پلندہ نکال کر ناشر سے بولا،

"چوہدری! یہ میری نئی کہانی ہے، اگر تم اس کے بدلے میں مجھے بیس روپے دے دو، تو —"

ناشر نے کہانی لے کو جیب میں رکھ لی اور بولا۔
"آپ ساحر سے قرض لے لیجئے۔ جب آپ لوگ لوٹیں گے، تو میں انھیں روپے دے دوں گا"

"تم اپنی کہانی واپس لے لو" میں نے ستیارتھی سے کہا — "آجکل میرے پاس روپے ہیں"
لیکن ناشر نے کہانی واپس نہیں کی، ستیارتھی چپ چاپ میرے ساتھ چل پڑا۔ راستے میں میں نے اس سے کہا،
"تم جلدی سے جا کر گھر اطلاع دے آؤ، ابھی گاڑی چھوٹنے میں کافی وقت ہے"

"نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں" وہ بولا، "میری بیوی میری عادت سے واقف ہے، اگر میں دو چار روز کے لئے گھر سے غائب ہو جاؤں تو اسے الجھن یا تشویش نہیں ہوتی"
"تمہاری مرضی" میں نے کہا، اور اس کو ساتھ لے کر......

چل پڑا۔

گاڑی مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی اور کہیں تِل تک دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ بہت سے لوگ باہر پائدانوں پر لٹک رہے تھے اور وہ جنھیں پائدانوں پر بھی جگہ نہیں ملی تھی۔ گاڑی کی چھت پر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے صرف فوجی ڈبوں میں جگہ تھی۔ لیکن ان میں غیر فوجی سوار نہیں ہو سکتے تھے،

"اب کیا کیا جائے؟" میں نے ستیارتھی سے پوچھا،

"ٹھہرو، میں کسی سپاہی سے بات کرتا ہوں۔" وہ بولا،

"کچھ فائدہ نہیں" ـــــ میں نے کہا ـــــ "وہ جگہ نہیں دینگے"۔

"تم آؤ تو سہی" وہ مجھے بازو سے گھسیٹتے ہوئے بولا، اور جا کر ایک فوجی سے کہنے لگا ـــــ "میں شاعر ہوں، لائل پور جانا چاہتا ہوں، آپ مجھے اپنے ڈبے میں بٹھا لیجئے۔ میں راہ میں آپ کو گیت سناؤنگا۔"

"نہیں نہیں، ہم کو گیت وِیت کچھ نہیں چاہیے۔" ڈبے میں بیٹھے ہوئے سپاہی نے زور سے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔

"کیا مانگتا ہے؟" ـــــ ایک دوسرے فوجی نے اپنی سیٹ پر سے اٹھتے ہوئے تیسرے فوجی سے پوچھا۔

تیسرے فوجی نے بنگالی زبان میں اسے کچھ جواب دیا۔

"میں سچ مچ شاعر ہوں" ستیارتھی نے کہا ـــــ "مجھے سب زبانیں آتی ہیں" ـــــ اور پھر وہ بنگالی بولنے لگا۔

فوجی سپاہی حیرت سے اس کا منہ تکنے لگے۔

"تامل جانتا ہے ؟" ـــــ ایک ناٹے قد کے سیہ فام فوجی نے ڈبے کی کھڑکی میں سے سر نکال کر اس سے پوچھا۔

"تامل، مرہٹی، گجراتی، پنجابی سب جانتا ہوں" ـــــ ستیار تھی نے کہا ـــــ "آپ کو سب زبانوں کے گیت سناؤں گا"۔

"اچھا؟" ـــــ تامل سپاہی نے کہا۔

"ہاں" ستیار تھی بولا، اور تامل میں اس سے باتیں کرنے لگا، اتنے میں انجن نے سیٹی دے دی،

"تو کیا میں اندر آجاؤں؟" ـــــ ستیارتھی نے پوچھا
دروازے کے قریب بیٹھا ہوا فوجی کچھ سوچنے لگا
"گیت پسند نہ آئیں، تو اگلے اسٹیشن پر اتار دینا" ستیار تھی بولا،
فوجی ہنس پڑا اور بولا،
"آجاؤ"

ستیار تھی میرے ہاتھ سے اٹیچی لے کر جلدی سے اندر گھس گیا،
میں ڈبے کے سامنے بت بنا کھڑا رہا۔

"آؤ آؤ، چلے آؤ" ستیار تھی نے سیٹ پر جگہ بناتے ہوئے دونوں ہاتھوں کے اشارے سے مجھے کہا۔

فوجیوں نے گھور کر میری طرف دیکھا،
میں دو قدم پیچھے ہٹ گیا
"یہ بھی شاعر ہے!" ستیار تھی بولا ـــــ "یہ بھی گیت سنائے گا، ہم دونوں

گیت سنائیں گے؟

سپاہیوں نے مجھے سر سے پیر تک غور سے دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ انھیں میرے شاعر ہونے کا یقین نہیں آ رہا۔ غالباً وہ سوچ رہے تھے کہ یہ تیئیس چوبیس سال کا چھوکرا وہی چیز کیونکر ہو سکتا ہے جو یہ لمبی داڑھی والا سنیاسی ہے

"تم بھی سب زبانیں جانتے ہو"؟ ایک فوجی نے دروازہ کھولتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"نہیں"، میں نے جواب دیا،

"ہوں" ـــــ اس نے کچھ اس انداز سے کہا، جیسے کہہ رہا ہو،

"پھر تم کیا جانتے ہو، پھر تمہارا کیا فائدہ ہے؟"

میں ستیارتھی کے ساتھ کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جب ٹرین چل پڑی تو میں نے ستیارتھی سے کہا۔

"میں اگلے جنکشن پر اتر جاؤں گا"

"لیکن اتر کر جاؤ گے کس ڈبے میں؟" وہ بولا،

میں خاموش ہو گیا۔

سپاہی بڑے اشتیاق اور دلچسپی سے ستیارتھی کے ساتھ باتیں کرنے لگے۔ ستیارتھی بڑے پیار کے ساتھ ان کے گاؤں، گاؤں کے قریب بہتی ہوئی ندیوں، ندیوں کے کنارے لہلہاتے ہوئے کھیتوں، رسموں، تیوہاروں کی باتیں کرتا رہا۔ جیسے وہ ان سب کو جانتا ہو۔ انہی میں سے ایک ہو اور جب باتیں ختم ہو گئیں تو ستیارتھی انھیں گیت سنانے لگا۔ سپاہی اس سے

متاثر ہوئے، ستیارتھی نے کہا۔

"لے کے بنا گیت کا مزہ آدھا رہ جاتا ہے، پھر بھی مجھکو اس وقت جتنے گیت یاد آئے، میں نے آپ کو سنا دیئے، اب آپ لوگوں میں سے جس کو گانا آتا ہو، وہ گا کر سنائے۔"

تامل سپاہی نے کہا ــــ "میں گانا جانتا ہوں، بولو، کون سا گیت سنوگے؟"

"کوڑی دا، کوڑی دا کادلالی" ستیارتھی بولا ــــ (مل کر پھینو امل کر پھینو مچھلیو!) ــــ "اس ڈبے میں جہاں ہر صوبے کے فوجی جمع ہیں اس سے موزوں اور کوئی گیت نہیں ہو سکتا۔"

"کیا مطلب؟" تامل سپاہی نے پوچھا۔

"کیا ہم مچھلیاں ہیں؟" پنجابی سپاہی چلایا۔

"غصہ مت کرو میرے دوست" ستیارتھی نے اسی تحمل اور اطمینان سے کہا ــــ "ہم سب مچھلیاں ہیں، تم بندوق والی مچھلی ہو، میں داڑھی والی مچھلی ہوں۔"

سپاہی ہنسنے لگے۔

"اور ہم سب مچھیروں کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں" ستیارتھی نے کہا۔

سپاہی پھر سنجیدہ ہو گئے۔

ٹرین تیزی سے بھاگی جا رہی تھی۔ باہر چاروں طرف گہرا اندھیرا تھا، اور اس اندھیرے میں اکا دکا تارے جگمگا رہے تھے۔ سپاہیوں نے ہمیں سونے

کے لئے جگہ بنا دی اور کہا۔

"آپ لوگ آرام کیجیے، صبح ہم آپ کو جگا دیں گے۔"

اگلے دن جب ہم ان صاحب کے مکان پر پہونچے جن سے مجھے ملنا تھا تو وہ گھر پر نہیں تھے۔ معلوم ہوا کہ آج ایک مقامی مجسٹریٹ کے ہاں ان کی دعوت ہے، وہ مجسٹریٹ مجھے بھی جانتے تھے، اس لئے ہم لوگ سیدھے وہیں چلے گئے، باتوں باتوں میں ستیارتھی نے بتایا، کہ وہ جھومر ناچ کی تصویر لینا چاہتا ہے؛

مجسٹریٹ صاحب نے کہا ——— "آجکل تو کسان فصل کاٹ رہے ہیں ناچ جیوڑ انھیں دم لینے کی بھی فرصت نہیں"

"فریڈ" ستیارتھی بولا ——— "میں تو بڑی آس لے کر آیا تھا۔"

مجسٹریٹ صاحب خاموش ہو گئے۔ جب ہم چلنے لگے تو انھوں نے ستیارتھی کو روک کر کہا ——— "آپ ضرور تصویر لینا چاہتے ہیں؟"

"ہاں" ستیارتھی نے کہا۔

"اچھا تو کل دو بجے کے قریب آپ تھانے میں تشریف لائیے میں بندوبست کر دوں گا۔"

"تھانے میں؟" ——— ستیارتھی نے حیرت سے میری طرف گھورتے ہوئے کہا۔

"ہاں، ہاں، ہم تھانے کے کچھ سپاہی بھیج کر دس بیس کسانوں کو جو ناچنا جانتے ہوں۔ جوگی پر بلا لیں گے، آپ جی بھر کر تصویرے لیجئے گا۔"

"جی نہیں، آپ تکلیف نہ کیجیے۔ میں پھر کبھی آجاؤں گا۔" ستیار تھی بولا "تھانیدار کے سامنے بھلا کسان خاک ناچیں گے؟"

اگلے دن ہم لوگ وہاں سے لوٹ آئے۔ راستہ بھر ستیار تھی مجسٹریٹ کی تجویز پر ہنستا رہا۔

یونیورسٹی امتحانات کے بعد میں لدھیانہ آگیا اور چار پانچ مہینے تک گھر ہی پر رہا۔ اس کے بعد اچانک پریت نگر کی سالانہ کانفرنس میں میری اور اس کی ملاقات ہوگئی۔

کانفرنس میں کوئی آٹھ دس ہزار مردوں اور عورتوں کا مجمع تھا، پنجاب کے ہر حصے سے لوگ اس عجیب وغریب بستی کو دیکھنے کے لئے آئے تھے جس کے احاطے میں مسجد، مندر، گوردوارہ یا گرجا تعمیر کرنے کی اجازت نہیں جہاں کے باسی مشترکہ کچن میں کھانا کھاتے ہیں اور جہاں کی عورتیں آزادی اور بے باکی کے ساتھ گھومتی پھرتی ہیں،

جب ستیار تھی پنڈال میں داخل ہوا تو ہجوم میں سے بہت سے مردوں نے اٹھکر اس کے ہاتھ چومے اور بہت سی عورتوں نے اس کے چرن چھوئے ستیار تھی نے انھیں آشیر باد دیا۔ اور مشتاق اور معتقد نظروں کے ایک بہت بڑے ہجوم میں سے گذرتا ہوا اسٹیج کے قریب جاکر بیٹھ گیا۔

پروگرام کی پہلی چیز ایک ڈرامہ تھا۔ جسے پریت نگر کے طلبا اور طالبات پیش کر رہے تھے۔ ڈرامے کے بعد پہلے پنجابی اور پھر اردو مشاعرہ تھا۔ ستیار تھی نے بھی ایک پنجابی نظم سنائی۔ جس کا مفہوم کچھ یوں تھا۔

ہندستان! ——— ہندستان!
تیرے ہل لہولہان ہیں
تیرا بدن چیتھڑوں میں لپٹا ہوا ہے،
تیری پوروں سے خون بہہ رہا ہے،
——— ہندستان!

صدیوں کا بھوکا پیاسا اڑیسہ دم توڑ رہا ہے
آسام کا "بہو ناچ" سوکھے ڈھانچوں کے ارتعاشِ جانکنی میں
تبدیل ہو گیا ہے،
بنگال پر موت کے گدھ منڈلا رہے ہیں۔
کالیداس سے کہو، کہ وہ "میگھ دوت" کو اٹھا کر پرے پھینک دے،
اودے شنکر سے کہو وہ اجنتا کا رقص بند کر دے،
آج چاروں طرف بھوک ہے، موت ہے، عریانی ہے، اور افلاس ہے،
مہاندی کی آنکھوں سے دکھ کے آنسو بہہ رہے ہیں،
اور صدیوں پرانی بانسری کے حلق میں نغمے سوکھ گئے ہیں۔

سٹیج پر کھڑا وہ ایک مافوق البشر ہستی دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی شخصیت ایک مفکر، ایک سنیاسی اور ایک شاعر کی شخصیت کا مرکب محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اپنی نظم میں ہندستان کے مختلف خطوں کا ذکر اس کامیابی سے کر رہا تھا، کہ سننے والے اپنے آپ کو مذکورہ خطوں میں سانس لیتے محسوس کرتے تھے، ایک کے بعد دوسرے خطے کی آبادی اپنے مخصوص تمدن کے پس منظر میں، مخصوص لباس پہنے اور

مخصوص زبان بولتی آہستہ آہستہ ان کی آنکھوں کے سامنے ابھرتی، اور پھر افق کے گوشوں میں گم ہو جاتی، یہ مشاق عکاسی ستیارتھی کی سالہا سال کی ریاضت اور اور ہندستان گردی کا پھل تھی۔ میں نے محسوس کیا، کہ ہندستان کا کوئی شاعر خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، ہندستان کی روح کا عکس پیش کرنے میں ستیارتھی کی ہمسری نہیں کر سکتا۔

پنجابی مشاعرے کے اختتام پر جب پندرہ منٹ کا وقفہ دیا گیا تو اردو پریت لڑی کے مدیر معاون شمشیر سنگھ خنجر نے مجھے بتایا، کہ اردو مشاعرے کے صدر ابھی تشریف نہیں لائے۔ میں نے کہا۔ شام کے وقت میں نے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کو یہاں دیکھا تھا۔ ان سے کہیے کہ وہ مشاعرے کی صدارت کر دیں۔ شمشیر سنگھ خنجر ایک ٹانگ اور ایک لکڑی کے سہارے اختر حسین رائے پوری کو ڈھونڈنے چلا گیا۔ ستیارتھی نے میرے قریب آکر پوچھا،

"تم شمشیر سنگھ خنجر کو کب سے جانتے ہو؟"

"قریباً ایک برس سے"

"میں چھ برس سے جانتا ہوں، اور اس سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں لیکن حوصلہ نہیں ہوتا" ستیارتھی نے کہا۔

"کون سا سوال؟" میں نے پوچھا۔

"میں اس سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس نے اپنا تخلص "خنجر"، ٹانگ ٹوٹنے سے پہلے رکھا تھا یا بعد میں"

اور پھر وہ اوورکوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ٹہلنے لگا۔ سامنے سے ایک

پنجابی شاعرہ آرہی تھی۔ ستیارتھی کی ہنسی ایک دم سنجیدگی میں تبدیل ہو گئی، اور اس نے فوراً اوورکوٹ کی جیبوں سے ہاتھ نکال لئے۔

"کہئے کدھر جا رہی ہیں آپ؟ اردو مشاعرہ نہیں سنئے گا؟" اس نے شاعرہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا،

"ضرور سنوں گی" شاعرہ بولی ——— "بیٹھے بیٹھے کچھ تھک سی گئی تھی اس لئے ادھر چلی آئی۔"

"ہاں ہاں ضرور سنئے گا، آج میں بھی اپنی ایک اردو نظم سناؤں گا، ساحر تم نے ان کی نظم سنی تھی؟"

"جی ہاں، بہت خوبصورت نظم تھی۔"

"اور اس میں روانی اور شدّت اور گہرائی کتنی تھی۔ واہ واہ، میں تو سوچتا ہوں، کہ مجھے شعر کہنا ترک کر دینا چاہیئے" ستیارتھی بولا،

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" ——— شاعرہ کہنے لگی ——— "آپ تو اتنا اچھا لکھتے ہیں ———"

"جی ہاں، جی ہاں" ستیارتھی بولا ——— "لیکن وہ بات پیدا نہیں ہوتی" اتنے میں شمشیر سنگھ نَخجر واپس آگیا۔ اس نے بتایا کہ اختر حسین رائے پوری واپس چلے گئے ہیں اور شاعروں کی تین ٹولیاں، تین مختلف شاعروں کا نام صدارت کے لئے تجویز کر رہی ہیں۔

میں نے پوچھا ——— "تو پھر تم نے کیا فیصلہ کیا؟"

"میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا"۔ وہ بولا۔

شاعرہ مسکرائی، اور پوچھنے لگی ——— "آپ کے ہاں صدارت تک پر فساد ہوتے ہیں؟"

"کچھ ایسا ہی ہے" ——— میں نے کہا

"کیوں؟" ——— اس نے کہا، مجھے جیسے اس سادگی پہ پیار آگیا۔

"ابھی شعراء کے سامنے زیادہ اہم مقاصد پیدا نہیں ہوئے۔ جب پیدا ہو جائیں گے، تو وہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑنا بند کر دیں گے۔"

شاعرہ خاموش ہو گئی۔

میں نے پوچھا ——— "آپ کیا ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتیں؟"

"میں؟ ——— میں کیا مدد کر سکتی ہوں؟" وہ بولی

"آپ ہمارے مشاعرے کی صدارت قبول فرما لیجئے"

"پر میں تو پنجابی زبان میں لکھتی ہوں"

"یہی تو ایک اچھی بات ہے" ——— میں نے کہا ——— "ورنہ ظاہر ہے، کہ ایک مشاعرے کے تین صدر نہیں بنائے جا سکتے۔ دو گروہ بہر صورت ناراض ہوں گے"

"لیکن یہ بھی تو ممکن ہے" ——— وہ بولی ——— "کہ میرے صدر بننے سے تینوں گروہ خفا ہو جائیں"

"نہیں آپ لڑکی ہیں، اس لئے ایسا نہیں ہوگا" شمشیر سنگھ خنجر بولا

شاعرہ کچھ محجوب سی ہو گئی، وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر کہہ نہ سکی میں نے خنجر سے کہا، آپ جا کر سٹیج سکریٹری کو ان کا نام صدارت کے لئے دے دیجئے"

خنجر چلا گیا

ایک منٹ بعد شاعرہ بھی چلی گئی

"او حرامزادے!" ستیارتھی چیخا، اور بہرہ بھی چلا گیا،

مجھے اس کا ایک مضمون یاد آگیا جس میں اس نے لکھا تھا۔ "ویری ناگ کے نیلگوں پانی میں تھکن سے چور پاؤں ڈالے میں سوچ رہا تھا، کہ میں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ ناحق خانہ بدوشی میں ضائع کر دیا۔ ناحق لوک گیتوں کی تلاش میں بھٹکتا رہا ناحق گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتے ہی کو آوارہ بنائے زندگی برباد کرتا رہا ——"

سٹیج پر کھڑا وہ ایک مافوق البشر ہستی دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن سٹیج سے اترتے ہی بہرہ وہ بشر بن گیا تھا۔ اور اس کے سینے میں ذاتی ناکامیوں کا درد جاگ اٹھا تھا۔ عمر کا بہترین حصہ ضائع ہو جانے کا درد۔

مشاعرے سے اگلے دن پریت نگر کے کچھ باسیوں کی طرف سے اردو اور پنجابی کے ادیبوں کو ایک مشترکہ پارٹی دی گئی۔ شاعرہ اور ستیارتھی ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ چائے کے ساتھ شاعری کا دور بھی چل رہا تھا۔ سب شاعروں نے ایک ایک نظم سنائی، لیکن جب ستیارتھی کی باری آئی تو وہ خاموش بیٹھا رہا

شاعرہ نے کہا —— "آپ کچھ سنائیے نا؟"

"چھوڑیئے جی" ستیارتھی بولا، —— "میری نظموں میں کیا رکھا ہے؟

آپ سنائیے" ستیارتھی نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"حادثہ" —— ایک کونے سے آواز آئی۔

ستیارتھی سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ بھک سے اس کا منہ کھلا اور تمام

چائے داڑھی اور کوٹ پر بکھر گئی۔ وہ میلے خاکی رومال سے چہرے پر اوٹ کئے اپنی کرسی سے اٹھا۔ اور نل پر جاکر منہ دھونے لگا۔ جب وہ منہ دھو کر واپس آیا تو اس کا چہرہ بیحد اداس تھا۔ شاعرہ کے ساتھ کی کرسی خالی چھوڑ کر وہ ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا تمام وقت اس نے کوئی بات نہ کی۔

پارٹی ختم ہونے کے بعد میں نے ستیارتھی سے اس کی خاموشی کا سبب پوچھا۔ تو وہ بہت دکھے ہوئے دل کے ساتھ کہنے لگا،

"میں مہذب لوگوں کی سوسائٹی میں بہت کم بیٹھا ہوں، میں نے اپنی تمام عمر کسانوں اور خانہ بدوشوں میں گذار دی ہے۔ اور اب، جب مجھے ماڈرن قسم کی محفلوں میں بیٹھنا پڑتا ہے تو میں گھبرا جاتا ہوں۔ میں زیادہ سے زیادہ احتیاط برتنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پھر بھی مجھ سے ضرور کوئی نہ کوئی ایسی حرکت ہو جاتی ہے۔ جو عام سماجی نقطہ نظر سے اچھی نہیں سمجھی جاتی"

مجھے ستیارتھی کی اس بات سے بہت دکھ ہوا؛ اس نے واقعی بہت بڑی قربانی دی تھی، لوک گیتوں کی تلاش میں اس نے ہندستان کا کونہ کونہ چھان مارا تھا۔ ان گنت لوگوں کے سامنے دامن پھیلایا تھا۔ بیسیوں قسم کی بولیاں سیکھی تھیں، کسانوں کے ساتھ کسان اور خانہ بدوشوں کے ساتھ خانہ بدوش بن کر اپنی جوانی کی امنگوں بھری راتوں کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ لیکن اس ساری کاوش اور ساری محنت ساری قربانی کے صلے میں اسے کیا ملا؟ —— ایک نیم فاقہ کش زندگی اور ایک ناآسودہ دل،

پریت نگر سے واپس آکر میں نے لاہور میں رسالہ ادب لطیف کے ادارے

میں ملازمت کرلی۔ ستیارتھی اپنا بیشتر وقت میرے ساتھ گذارنے لگا۔ ہر روز صبح سویرے وہ مجھے بستر سے اٹھا دیتا اور رات گئے تک میرے ساتھ گھومتا رہتا۔ کبھی کبھی جب اس کی طبیعت لہر پہ ہوتی تو وہ مجھے پنجاب کے دیہاتی گیت سنانے لگتا۔

"کیہڑے پنڈ مکلاوے جانا۔ نی ٹاہلی دے صندوقاں والئے"

(اے شیشم کا صندوق لے کر جانے والی! تیرا بیاہ کس گاؤں میں ہوا ہے؟)

"اگ بال کے دھوئیں دے پج روواں بھیڑے دکھ یاریاں دے"

(آگ جلا کر آنکھوں میں دھواں پڑ جانے کے بہانے روتی ہوں محبتوں کے دکھ بہت برے ہوتے ہیں)

گیت سناتے سناتے وہ خاموش ہو جاتا، اور کہتا — "چاہے میری اقتصادی حالت کتنی ہی بری کیوں نہ ہو لیکن میں عظیم آدمی ہوں"

"اس میں کیا شک ہے" میں جواب دیتا،

وہ میرے کندھے پہ ہاتھ مار کر ہنسنے لگتا، اور کہتا —— "تم بھی عظیم آدمی ہو"

اس نے تمام کالجوں اور ہوسٹلوں میں اپنے اڈے بنا رکھے تھے ہر روز وہ کسی نہ کسی ہوسٹل میں چلا جاتا، اور بیٹھا گپیں ہانکتا رہتا۔ طلباء اسے بڑے اشتیاق اور احترام سے ملتے۔ چائے پلاتے۔ کھانا کھلاتے، اور اگر ستیارتھی رضامند ہوتا تو اسے اپنے ساتھ سینما بھی لے جاتے۔

ایک دوپہر جب میں دفتر میں داخل ہوا تو ایک خوش پوش نوجوان پہلے سے میرا منتظر تھا۔

"میں دیویندر ستیارتھی ہوں" اس نے کہا۔

میری آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں، داڑھی مونچھ صاف اور سر پر کالبجئین کٹ کے مختصر سے بال، "یہ دیویندر ستیارتھی کو کیا ہوا؟" میں نے سوچا

"بیٹھو" اس نے مجھے حیران کھڑے دیکھ کر کہا۔

میں بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر میں اسے اپنے ساتھ قریب کے ایک ہوٹل میں لے گیا۔ جب بوائے چائے لے آیا، تو میں نے پوچھا،

"تم نے آخر یہ وضع قطع کیوں بدل ڈالی؟"

"یوں ہی" وہ بولا،

"یہ تو کوئی جواب نہ ہوا" میں نے کہا، "آخر کچھ تو وجہ ہوگی"

"وجہ؟ ——— وجہ در اصل یہ ہے" وہ بولا ——— "کہ میں اس ہیئت سے تنگ آگیا تھا۔ پہلے پہل جب میں گیت جمع کرنے نکلا تھا تو میری صورت ایسی نہیں تھی، اس وقت مجھے گیت اکٹھے کرنے میں بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لوگ مجھ پر بھروسہ نہیں کرتے تھے، لڑکیاں میرے قریب بیٹھتے ہوئے ہچکچاتی تھیں، پھر میں نے داڑھی اور سر کے بال بڑھا لئے اور بالکل سنیاسیوں کی سی شکل بنالی، اس ہیئت نے میرے لئے بہت سی آسانیاں پیدا کردیں۔ دیہاتی میری عزت کرنے لگے۔ لڑکیاں مجھے درویش سمجھ کر مجھ سے تعویذ مانگنے

لگیں، میں نے دیکھا، اب انھیں میرے قریب آنے میں جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی
میں گھنٹوں بیٹھا ان سے گیت سنتا رہتا۔ اب مجھے بھیک بھی بہ آسانی مل جاتی تھی، اور
بلا ٹکٹ ریل کا سفر کرنے میں بھی سہولت حاصل ہوگئی تھی، آہستہ آہستہ داڑھی اور
جٹائیں میری شخصیت کا جزو بن گئیں۔"

"پھر؟" میں نے پوچھا۔

"پھر میں شہر میں آگیا" وہ بولا "اور مضمون نگاری پر گذر اوقات کرنے
لگا۔ میں دوسرے ادیبوں کو دیکھتا، تو انھیں ایک دوسرے سے انتہائی بے تکلف پاتا
تمام وقت وہ ایک دوسرے سے ہنسی کھیل اور مذاق کرتے رہتے، لیکن یہی لوگ
مجھ سے بات کرتے تو ان کے لہجوں میں تکلف آجاتا۔ مجھ میں اور ان میں تعظیم کا ایک
مصنوعی سا پردہ حائل ہو جاتا، مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میں ان کے دلوں سے
بہت دور ہوں۔ عام لوگ بھی جب میرے سامنے آتے۔ تو مؤدب بیٹھ جاتے جیسے
وہ کسی دیوتا کے سامنے بیٹھے ہوں، اپنے سے بلند اور مختلف ہستی کے سامنے،"

"پھر؟" میں نے کہا۔

"عام مردوں کی نگاہ پڑتے ہی لڑکیوں کے چہروں پر سرخی دوڑ جاتی، ان
کے گال تمتما اٹھتے۔ لیکن جب میں ان کی طرف دیکھتا، تو ان کے عارض کا رنگ
وہی رہتا، وہ فیصلہ نہ کرسکتیں کہ میں ان کی طرف پدرانہ شفقت سے دیکھ رہا ہوں
یا عاشقانہ وارفتگی سے؟" میں اس زندگی سے تنگ آگیا تھا۔" وہ بولا۔ "میں
نے فیصلہ کر لیا کہ میں اپنی اس ہیئت کو تبدیل کر دوں گا۔ میں دیوتا نہیں ہوں،
انسان ہوں، میں انسان بن کر رہنا چاہتا ہوں۔"

"پھر؟" میں نے آخری بار کہا۔

"فر؟ ——— فرمیں اس وقت تمہارے سامنے بیٹھا ہوں، کیا میری ہیئت عام انسانوں کی سی نہیں ہے؟"

"ہے اور بالکل ہے" ۔ میں نے کہا ——— "لیکن ایک بات بتاؤ حجام نے تم سے کیا چارج کیا؟"

"پانچ روپے" ستیار تھی نے کہا ——— "لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"یوں ہی" میں نے کہا۔

اور پھر ہم دونوں مسکرانے لگے۔

شاعرہ نے سنا تو حیران رہ گئی ——— "میں ستیارتھی جی کو اس نئے روپ میں ایک نظر دیکھنا چاہتی ہوں، کیا آپ انھیں یہاں لا سکیں گے؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"میں کوشش کروں گا" میں نے جواب دیا۔

اگلے دن میں نے ستیارتھی کو بتایا کہ شاعرہ اس سے ملنا چاہتی ہے

"سچ؟" اس نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے پوچھا۔

"سچ" میں نے کہا۔

"تو پھر کب چلو گے؟"

"کل کسی وقت آجانا، میں گھر ہی پر رہوں گا"

"بہت اچھا" ۔ اس نے کہا۔

اگلے دن صبح ٹھیک پونے چھ بجے اس نے مجھے بستر سے اٹھا دیا۔

"تم رات کو سوئے بھی تھے یا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یار! ایک بات بتاؤ" اس نے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا "میں شاعرہ کی تصویر لینا چاہتا ہوں، کیا وہ رضامند ہو جائے گی؟"

"وہیں تو چل رہے ہو، پوچھ لینا"

"میں کیمرہ لیتا آیا ہوں" وہ بولا۔

"بہت اچھا کیا، دشمن کے گھر غیر مسلح حالت میں نہیں جانا چاہئے" میں نے کہا۔

ستیارتھی کو دیکھتے ہی شاعرہ کھل اٹھی "ارے آپ تو بالکل نوجوان ہیں" وہ بولی۔

ستیارتھی کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن عین اسی وقت شاعرہ کا پتی کمرے میں داخل ہو گیا۔

"آپ نے انھیں پہچانا؟ — یہ دیوندر ستیارتھی ہیں" شاعرہ نے کہا۔

شاعرہ کے پتی نے ستیارتھی کو سر سے پیر تک گھورا۔ پھر اس کے قریب بیٹھ کر آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگا۔

ستیارتھی نے کہا "میں آپ دونوں کی تصویر لینا چاہتا ہوں"

"تصویر؟ ۔ تصویر کیا کیجئے گا" شاعرہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اپنے البم میں لگاؤں گا — میں نے سب ادیبوں کی تصویریں لی ہیں"

"آپ کو شاید معلوم نہیں" شاعرہ نے اپنے شوہر سے کہا "ستیارتھی

جی بہت اچھے فوٹوگرافر ہیں۔"

"میں بہت اچھا افسانہ نگار اور شاعر بھی ہوں۔" ستیارتھی نے کہا
شاعرہ جھینپ گئی۔

"تو پھر بتائیے" ستیارتھی بولا۔ "میں نے سب ادیبوں کی تصویریں
لی ہیں۔"

"آپ ان سے براہ راست پوچھئے" شاعرہ کے پتی نے مسکراتے
ہوئے کہا۔

"مجھے تو آپ جانتے ہیں، ادب سے کوئی سروکار نہیں۔"

"ادب سے نہ سہی، ادیبہ سے تو ہے" ستیارتھی نے کہا۔ "آپ
کی اجازت کے بغیر میں تصویر کیسے لے سکتا ہوں؟"

"میں نے انھیں ہر بات کی اجازت دے رکھی ہے" شاعرہ کے پتی نے
کہا۔

"تو پھر آپ دونوں چلیے۔"

"کہاں" شاعرہ بولی۔

"چھت پر" ستیارتھی نے کہا۔ "وہاں لائٹ مل سکے گی"

سب لوگ چھت پر چلے گئے۔ ستیارتھی کوئی دو گھنٹے تک شاعرہ اور
اس کے پتی کی تصویریں اتارتا رہا۔ تین تصویریں اس نے شاعرہ کی اس کے پتی کے ساتھ
لیں اور سات تصویریں الگ۔ باہر نکل کر اس نے مجھ سے کہا۔

"میں نے تینوں تصویروں میں شاعرہ کے پتی کو اس سے ذرا فاصلہ پر

کھڑا کیا ہے تاکہ شاعرہ کی تصویر کا علیحدہ پرنٹ نکالنے میں آسانی رہے"
اسی طرح ایک مہینہ گذر گیا۔ ہر دوسرے تیسرے دن ستیارتھی شاعرہ کی تصویر کا انلارجمنٹ بنالاتا۔ اور آکر مجھ سے کہتا "چلو یہ انلارجمنٹ اسے دے آئیں"
ایک دن ستیارتھی نے شاعرہ سے کہا ــــ "میں آپ کی کچھ اور تصویریں لینا چاہتا ہوں"
"اور تصویریں کیا کیجئے گا؟" شاعرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس دن اتنی بہت سی تصویریں تو آپ لے چکے ہیں؟"
"آپ مجھے کوئی ایسا وقت دیجئے۔ جب آپ کے پتی گھر پر نہ ہوں"
"وہ کس لئے"
"در اصل بات یہ ہے . . . . . " ستیارتھی نے کہا اور پھر وہ لائل پور کے مجسٹریٹ اور کسانوں کا قصہ سنانے لگا "تو معاف کیجئے" اس نے پورا قصہ سنانے کے بعد کہا "آپ کے پتی کے سامنے آپ کا فوٹو لینا بھی بالکل ایسا ہی ہے۔ جیسا تھانیدار کے سامنے کسان نچوانا"
شاعرہ کا پتی دوسرے کمرے میں ساری باتیں سن رہا تھا۔ وہ ستیارتھی پر بہت خفا ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ شاعرہ پر بھی بگڑا۔
اگلے دن شاعرہ نے مجھے دفتر میں رقعہ بھیج کر بلایا۔ اور کہا "آپ جانتے ہیں، میری زندگی بڑی مجبور قسم کی زندگی ہے۔ ستیارتھی جی نے اس دن کچھ ایسی باتیں کہدیں جس پر میرے پتی سخت ناراض ہیں۔ آپ ستیارتھی جی سے کہدیجئے کہ

میری تصویروں کے جو نگیٹو ان کے پاس ہیں، وہ کسی کے ہاتھ میرے پتی کو واپس بھجوا دیں۔"

"بہت اچھا" میں نے کہا۔

ستیارتھی نے نیگیٹو واپس کر دیئے، شاعرہ کے پتی نے کہا: "آپ ان کی قیمت لے لیجئے"!

ستیارتھی کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا۔

"میں بہت غریب ہوں، یہ صحیح ہے لیکن میں نے ابھی تک فوٹو گرافی کو ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ جب بنالوں گا تو آپ کو اطلاع دے دونگا"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر دو تین ماہ تک میں نے اس کی صورت نہیں دیکھی۔ اسی دوران میں مجھے بمبئی کی ایک فلم کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ میں ستیارتھی سے ملنے اس کے گھر گیا۔

وہ ٹیبل لیمپ کی ہلکی روشنی میں، اپنے چھوٹے سے کمرے میں میز پر جھکا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔ قدموں کی آہٹ سن کر اس نے دروازے کی طرف مڑ کر دیکھا۔"

"ہیلو ساحر!"

میں اندر چلا گیا۔

ستیارتھی نے داڑھی اور سر کے بال پھر سے بڑھا لئے تھے۔

"میں کل شام کی گاڑی سے جا رہا ہوں" میں نے کہا۔

"کیوں"؟

" مجھے ایک فلم کمپنی میں ملازمت مل گئی ہے"

" اچھا؟" اس نے کہا ۔۔۔۔ "تب تو آج تم سے لمبی چوڑی باتیں ہونی چاہئیں" ۔۔۔۔ اس نے فونٹین پن بند کر کے میز پر رکھدیا،

اتنے میں ستیارتھی کی بیوی اندر آ گئی۔ صورت شکل سے اس کی عمر انتیس تیس برس کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر نمستے کہا۔

" نمستے" وہ بولی،

ستیارتھی نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ آج یہیں رہیں گے، اور کھانا بھی یہیں کھائیں گے"

وہ جا کر کھانا لے آئی۔ ستیارتھی کی نو سالہ بچی کویتا بھی آ گئی، ہم سب کھانا کھانے لگے۔ ستیارتھی کی بیوی ہمارے قریب بیٹھی دستی پنکھے سے ہوا کرتی رہی۔

"کھانا ٹھیک ہے؟" اس نے پوچھا۔

" صرف ٹھیک ہی نہیں، بے حد لذیذ ہے" میں نے کہا۔

"ہم لوگ بہت غریب ہیں" وہ بولی۔

اچانک مجھے اپنے سوٹ کا خیال آ گیا۔

" میرے پاس یہی ایک سوٹ ہے" میں نے کہا ۔۔۔۔ "اور یہ بھی میرے ماموں نے بنوا کر دیا ہے"

وہ ہنسنے لگی۔ ایک نہایت بے جھجک اور پاکیزہ ہنسی۔ اور جب وہ کھانے کے جھوٹے برتن اٹھا کر چلی گئی۔ تو ستیارتھی نے مجھ سے کہا،

"اس عورت نے میرے ساتھ ان گنت مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ ہندستان کا کوئی صوبہ ایسا نہیں۔ جہاں یہ مجھ بھکاری کے ساتھ بھکارن بن کر ماری ماری نہ پھری ہو، اگر یہ میرا ساتھ نہ دیتی تو شاید میں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکتا۔"

"تمہاری زندگی قابل رشک ہے۔" میں نے کہا۔

"زندگی ہے ــــ شاید زندگی سے تمہارا مطلب بیوی ہے۔ میری بیوی واقعی قابل رشک ہے، اگرچہ کئی بار۔ اس کی معمولی شکل وصورت سے میں بیزار بھی ہو گیا ہوں۔"

میں دیوار پر لگی ہوئی تصویروں کی طرف دیکھنے لگا۔ لینن، . . . . . ٹیگور . . . . . اقبال . . . . .

"ان تینوں کی شکل وصورت کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ان تینوں کا میری زندگی پر گہرا اثر ہے۔" ستیارتھی بولا، اور پھر نہ جانے کن یادوں میں کھو گیا۔ "جب میں بالکل نوعمر تھا"، ــــ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا ــــ "تو میں نے خودکشی کا ارادہ کیا تھا بعض دوستوں کو پتہ چل گیا۔ وہ مجھے پکڑ کر ڈاکٹر اقبال کے پاس لے گئے۔ اقبال بہت دیر تک مجھے سمجھاتے رہے . . . . . ــــ ان کی باتوں نے مجھ پر بہت گہرا اثر کیا، اور میں نے خودکشی کا خیال ترک کر دیا،

"پھر میں لینن کی تعلیمات سے روشناس ہوا، اور میرے دل میں گاؤں گاؤں پھر کر دیہاتی گیت جمع کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔
ٹیگور نے میرے اس خیال کو سراہا اور میری حوصلہ افزائی کی۔ میں گیت جمع کرتا رہا، اور اب، —— جب یہ تینوں مر چکے ہیں، نو راتوں کی خاموش تنہائی میں، ان گیتوں کو اردو، ہندی یا انگریزی میں ڈھالتے وقت کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے کسان عورتیں اور مرد میرے گرد حلقہ بنائے کھڑے ہوں اور کہہ رہے ہوں، —— "سنیاسی! ہم نے تمہیں اپنا سمجھا تھا، تم پر بھروسہ کیا تھا۔ تم ہماری صدیوں کی پونجی کو ہم سے چھین کر شہروں میں فروخت کر دوگے، یہ ہمیں بھول کر بھی شک نہیں ہوا تھا۔ لیکن تم ہم میں سے نہیں تھے تم شہر سے آئے تھے اور شہر کو لوٹ گئے۔ اب تم ان گیتوں کو جو ہمارے دکھ سکھ کے ساتھی تھے۔ جن پر اب تک کسی فرد کے نام کی مہر نہیں لگی تھی، اپنے نام کی چھاپ کے ساتھ بازار میں بیچ رہے ہو اور اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پال رہے ہو، تم بہروپیے ہو، فریبی، دغاباز ہو ——" اور پھر وہ جلتی ہوئی آنکھوں سے مجھے گھورنے لگتے ہیں۔"

"یہ تمہارا جذباتی پن ہے!" میں نے کہا —— "تم نے ان گیتوں کو گاؤں کی محدود فضا سے نکال کر لامحدود کر دیا ہے، تم نے ایک مرتے ہوئے تمدن کی گود میں مہکنے والے پھولوں کو خزاں کی دست برد سے بچا کر ان کی مہک کو لازوال بنا دیا ہے، یہ تمہارا کارنامہ ہے، آزاد اور اشتراکی ہندوستان میں جب تعلیم عام ہو جائے گی۔ اور صنعتی زندگی شباب پر آئے گی۔ تو یہی کسان جو آج تمہارے خیالوں

ہیں تمہیں جلتی ہوئی آنکھوں سے گھورتے ہیں۔ تمہیں محبت اور پیار سے دیکھکر مسکرائیں گے، ان کے بچے تمہیں عقیدت اور احترام کے جذبات کے ساتھ یاد کریں گے اور فراغت کے لمحوں میں تمہارے ان مضامین اور افسانوں کو پڑھیں گے۔ جن میں تم نے ان کے آباواجداد کے دل کی دھڑکنیں سمودی ہیں، اور ایک بار پھر وہ اس تمدن کی جھلکیاں دیکھ سکیں گے جو اس وقت معدوم ہو چکا ہو گا"۔

وہ مسکرانے لگا۔

اگلے دن میں لاہور سے چلا آیا اور بمبئی میں فلمی گیت لکھنے لگا۔ تھوڑے دنوں کے بعد میں نے سنا، کہ ستیارتھی نے لاہور چھوڑ دیا اور دہلی کے کسی نیم سرکاری اخبار کے ادارے میں ملازمت کر لی۔ مجھے یقین ہے کہ اب ستیارتھی کا لباس پہلے کی طرح میلا کچیلا نہیں ہوتا ہو گا۔ اس کے جوتے بھی اب لاہور کے مشہور ناشر کے جوتوں کی طرح قیمتی اور چمکیلے ہوں گے، ننھی منی کویتا اب بڑی ہو گئی ہو گی اور تانگے میں سکول جاتی ہو گی، لیکن کسان؟۔

شاید اب بھی ستیارتھی ان کے بارے میں سوچتا ہو،

گائے جا ہندستان

لال دھرتی

گلے جا ہندوستان

ویری ناگ کے نیلگوں پانی میں تھکن سے چور پاؤں ڈالے میں سوچ رہا تھا کہ میں
نے اپنی عمر کا بہترین حصہ ناحق خانہ بدوشی میں گذار دیا۔ ایک طرف ذاتی پریشانیاں اور دوسری
طرف لہولہان دنیا کی لہولہان خبریں اور پھر یہ خیال کہ دیش میں ایک بھیانک قحط آنے والا ہے
پچاس سے اوپر زبانوں کے ڈھائی تین لاکھ لوک گیت جو میری خانہ بدوشی کے ضامن ہیں
مجھے چھوٹی تسلیاں دینے سے قاصر تھے، اور شیش ناگ کی طرح پھن پھیلائے ویوہیکل
پہاڑ نیچے مچھلیوں کی سبک خرامیوں اور مغلئی فن تعمیر کے آخری نشانات پر نازاں ویری
ناگ ایک بار پھر یہ خیال آیا کہ میں فن کی تخلیق کے لئے پیدا ہوا ہوں اور یقیناً قدیم روایتوں
کے اشوک کی طرح، جو اپنے تنے پر کسی گوری کے نازک پیروں کا لمس محسوس کرتے
ہی کھل اٹھتا تھا، جنتا کی شاعری اور قدرت کی سحر طرازیوں نے مجھے فن کار بنا دیا ہے
لیکن قدرت میری حاسد بن گئی ہے۔ مجھے ان لوگوں پر غصہ آ رہا تھا جو یہ سمجھتے تھے کہ ہر
چشمہ پر کسی نہ کسی ناگ کا حکم چلتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے غصے سے چشمہ ہمیشہ کے لئے

خشک ہوسکتا ہے اور جواندھی عقیدت سے مجبور ہوکر ناگ اور چشمہ کو ہم معنی الفاظ سمجھنے لگ گئے ہیں۔ یہ لوگ سانپوں کی پوجا کرسکتے ہیں۔ ایک فنکار کی نہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ ہر سال ویری ناگ پر جہلم کا جنم دن منایا جاتا ہے۔ بھادوں کے اجالے پاکھ کی تیرہویں کے روز جب اس نیلگوں پانی میں نہانا ثواب سمجھا جاتا ہے۔ یہ لوگ چشموں کی پوجا کرسکتے ہیں ایک فنکار کی نہیں . . . . مجھے اس گوری پر بھی غصہ آنے لگا جو ہر روز آدھی رات کو جب بیلے کے پھول کھل جاتے ہیں، اپنا گجرا بنا لیتی تھی، اور جواب تک یہ فیصلہ نہ کرسکی تھی کہ اسے کس کے گلے میں پہنائے ۔" بیلا پھولے آدھی رات، گجرا میں کیکے گلے ڈالوں؟ . . . . مجھے اس گوری پر بھی غصہ آنے لگا۔ جسے ظالم والدین نے ایک جاہل کے گلے میں باندھ دیا تھا اور جس میں اب اتنی ہمت نہ تھی کہ اپنے لئے کوئی نئی راہ ڈھونڈھ نکالے ۔" رتن گھوڑی گھی جلے، چولھے جلے کسار۔ گھونگھٹ میں گوری جلے جس کے مرکھ بھرتار" اور پھر پورب اور ہریانے سے ہٹ کر میرے ذہن کی سوئی چھوٹا ناگپور کی طرف گھوم گئی۔ جہاں قدیم النسل اراؤں دوشیزہ اپنے سینوں کے دو لھے سے التجا کررہی تھی ارے اور گیت گانے والے کوئی بھلا سا نغمہ چھیڑ دے رے۔ مرے ہوؤں کی آتمائیں سننے آتی ہیں . . .

. . .

میں سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی حقیقت یہی ہے ۔" بیلا پھولے آدھی رات" . . . . گھونگھٹ میں گوری جلے" . . . . یا وہ اشا کا نغمہ جسے مردوں کی آتمائیں سننے آتی ہیں۔ شاہو بولا! "ٹھیک تو ہے۔ پہلے نغمہ پھر کچھ اور" پھر طنز نگار کی آواز آئی" اصل حقیقت تو زندگی کے مسائل ہیں جن سے ڈر کر تم اتنی دور نکل آئے ہو" اور پھر دور کہیں سے بلبل کا نغمہ گونج اٹھا، جیسے وہ کہہ رہی ہو " زندگی کے مسائل تو کبھی ختم نہیں ہوتے، باورے تو کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ تم میرے نغمہ میں پناہ لو؟"

سائے بڑھ رہے تھے سورج کی آخری کرنیں بھی غائب ہوگئیں۔ آزاد کھلنڈری نٹ کھٹ ہوا بھی سست ہوگئی۔ اب پانی میں پاؤں ڈالے رکھنے کی ضرورت نہ تھی میرے دھن کے پاتال بھیل ناچ رہے تھے۔ ٹپ ٹپ، ٹھم ٹھم ٹھم، ایک ایک بھیل کے بعد ایک ایک بھیلنی۔ دائیں ہاتھ سے دائیں ساتھی کا بازو تھامے اور بائیں ہاتھ سے بائیں ساتھی کا رنگ بھومی کے مرکز میں جو کھادیا روشن تھا۔ شاعر کہہ رہا تھا۔ یہ لوگ حقیقی فن کار ہیں انھیں ملک گیری کی پرواہ ہے نہ تحریک آزادی کی فکر۔ ڈھولک کہتی ہے۔ یہ سب میرے تال کا تماشہ ہے۔ یہی حقیقت ہے۔ پازیبیں کہتی ہیں۔ یہ سب ہماری جھنکار کا نشہ ہے۔ کڑوی نیم کی ایک شاخ میٹھی ہے رے، میرا دھن رنگیلا ہے۔ چند آنوں کے عوض دن بھر مٹی کھودتے کھودتے ان کے بیلچوں کے منہ ٹیڑھے ہوگئے۔ لیکن اس وقت وہ کڑوی نیم کی میٹھی شاخ کے نیچے اپنا آزاد ناچ ناچ رہے تھے، نغمہ و رقص کے زیر و بم ان کے لئے کافی ہیں۔ پھر طنز نگار کی آواز آئی؟ "بھیلوں کا ناچ محض مزار ہے۔ ان کا تمدن ان کے لئے افیون بن گیا ہے۔ جو حقیقت میں زہر ہے۔ لیکن نشیلا بھی ہے،" شاعر بولا "تم غلط کہتے ہو۔ زندگی کے پیڑ کی میٹھی شاخ کے نیچے فن کاروں کا فن قائم رہ سکتا ہے یہ لوگ یقیناً ان عامیوں پر خندہ زن ہونے کا حق رکھتے ہیں۔ جو قانون بناتے ہیں۔ دفتر میں نوکری کرتے ہیں اور ناچ گھر میں دیر ہو جائے تو صبح کو اسپرین کی گولیاں کھائے بغیر سردرد سے چھٹکارا نہیں پا سکتے۔"

دودھیا سفید چاندنی کھل گئی تھی۔ فضا میں خوشبوئیں بسی ہوئی تھیں —— خوشبوئیں اور سرگوشیاں، آنکھیں میچ کر میں نے نیم وا پلکوں میں سے ویری ناگ کی طرف دیکھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ چناب ہے اور کوئی سوہنی کچے گھڑے پر تیر رہی ہے

شاعر بولا "سوہنی اب بھی زندہ ہے سوہنی خود ڈوب گئی ہے۔ پر اس کی روح چناب کے پانیوں پر تیر رہی ہے" طنز نگار کہہ رہا تھا "یہ پنجابی لوک گیت فضول ہے۔ کچے گھڑے پر تیرنے والی سوہنی بے وقوف تھی"

میری حالت اس پجاری کی سی تھی جو اپنے من مندر میں ان گنت بت رکھتا چلا گیا ہو، اب اس مندر میں بھیل جھوکریاں ناچ رہی تھیں۔ دیوداسیوں کی طرح :-

آنکھ کا کاجل پھیل رہا ہے،
انگئے کا پھندنا جھک رہا ہے،
روٹھ کر چلی نہ جائیو چھوکریو۔ ہم گھوم گھوم کر ناچیں گی
آؤ۔ آؤ ری چھوکریو، ہم گھوم گھوم کر ناچیں گی۔

شاعر بولا "آنکھوں میں کاجل کی لکیریں پھیل جانے سے پیشتر ہی تو جھومر کا مزا ہے۔ وہ پورب کا نغمہ بھی سنا ہوگا۔ "کبھی آپ ہنسے کبھی نین ہنسیں۔ کبھی نین کے بیچ ہنسے کجرا" پھر طنز نگار کی آواز آئی "ہنستے ہوئے کاجل کی عمر کے گھڑی کی ہوگی؟ طنز نگار کہہ رہا تھا! "کاجل میں کیا دھرا ہے؟ گانا ہی ہو تو مزدوروں اور کسانوں کا بین الاقوامی گیت گاؤ ـــ اے دنیا کے مظلوم انسانو، اٹھو، اٹھو اے بھوکے محنت کشو۔ انصاف کا جوالا مکھی ابل رہا ہے، اپنے ماضی کو بھلا دو۔ ساری دنیا کے غلامو، ایک ساتھ مل کر اٹھو۔ دنیا نئی کروٹ لے رہی ہے۔ اب تک ہم کچھ بھی نہیں تھے، اب ہم ہی سب کچھ ہوں گے۔ یہ ہماری آخری جنگ ہے۔ آؤ ہم تم ایک ہو جائیں۔ دنیا کی تمام قومیں ایک ہو جائیں گی"

چاندنی رات کی ہر سلوٹ گہری تھی، چاند سے تو سائے ہیں، یہی حقیقت

ہے۔ ستارے کہتے تھے کہ ہم شاعر پر بھی اس طرح چمکتے ہیں جیسے طنز نگار پر ...

جنگ شدید سے شدید تر ہوتی جاتی تھی۔ بم باری، آگ ہی آگ، بھوک اور موت، زہریلی گیسیں، زخمیوں سے بھرے ہوئے ہسپتال۔ کون جانے یہ جنگ کب ختم ہو، میں نے سوچا۔ جنگ سے پہلے اس دیس میں ایک بھیانک قحط آنے والا ہے، اس وقت مجھے اس ماہیر کا دھیان آیا۔ جس کا عشق بھوک کے مارے ختم ہو رہا تھا "بھکیا کے مارے برہا بسر گیا، بھول گئی کجری کبیر! دیکھی کے گوری کی موہنی سورتی، اب اٹھے نہ کریجوا ماں پیر!" ۔۔۔ بھوک کے مارے برہا بسر گیا، کجری اور کبیر گربت بھی بھول گئے۔ گوری کی موہنی صورت دیکھ کر اب میرے کلیجے میں درد نہیں اٹھتا

اپنی اقتصادی حالت پر غور کرتے کرتے ایک بار پھر اپنے ماضی پر جھنجھلاہٹ سی ہوئی۔ ناحق میں لوک گیتوں کی تلاش میں بھٹکتا رہا۔ ناحق گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے ہی کو آدرش بنائے، عمر برباد کرتا رہا۔ پھر میں نے یہ کہہ کر دل و دماغ کو تسلی دی کہ عالمگیر مصیبتوں کے پیش نظر میری تکلیف کی کیا اہمیت ہے۔ شاعر بولا! جہاں گردی سے بڑی کوئی تعلیم نہیں۔ فن کی پختگی کے لئے اس سے بڑا کوئی معاون نہیں۔

جگنو اپنی آنکھ مچولیوں میں مگن تھے۔ پاس ہی ایک منزلی جھروکے میں دیا روشن تھا۔ ویری ناگ کی چاندنی رات ایک نازک بدن حسینہ کی طرح نرم گہرے سانس لے رہی تھی۔ اس وقت میرے ذہن کی سوئی بہار کے ترہٹ ضلع کی طرف گھوم گئی اور ایک کسان کی آواز آنے لگی۔

۔ ہے شیو بابا! تم نے میرے دن کتنے دکھ بھرے بنا ڈالے
تھوڑی بہت کھیتی تھی وہ بھی تم نے چھین لی
سگے بھائی تھے، وہ الگ ہو گئے۔

گھر میں خرچ نہیں۔ باہر قرض نہیں ملتا۔
گاؤں کا زمیندار، رات کو سونے نہیں دیتا
ایک لوٹا ہے اور ہم تین بھائی ہیں
پانی پیتے وقت چھینا جھپٹی ہونے لگتی ہے
ایک بیل بچ گیا تھا، اسے مہاجن نے قرض کے بدلے لے لیا۔
کٹمب والے سب پرائے ہو گئے

"شاعر بولا! یہ تو یہی دو اور دو ؟ — چار روٹیاں !، والی شاعری ہے کوئی نازک خیالی نہ ہو تو شاعری بیکار ہے،، طنز نگار کہہ رہا تھا!" مجھے تو یہ لگتا ہے کہ یہ لوگ قسمت کے غلام ہیں، اقتصادیات کی باتوں میں خدا کو لے بیٹھتے ہیں، اپنی غریبی کو دیوتاؤں سے تعبیر کرتے ہیں ۔جب اس قدر جہالت ہے۔ یہاں انقلاب کیسے آسکتا ہے ؟"

پھر کہیں سے بندیلکھنڈ کی ایک پھاگ گونج اٹھی :-
گیہوں تھا وہ ختم ہو گیا۔
بھوسے کو جھگڑا اڑا لے گیا۔
گھاٹے میں بیل بک گئے۔
بنئے کا بیاج لوٹانے میں میری ہنسلی چلی گئی
جرمانے میں میری دونوں چھاتیاں لکھ کر لے جاؤ۔

طنز نگار نے شاعر سے پوچھا:" اس لازوال تلخی اور طنز کے آگے بولنے کی جرأت ہے تم میں۔ یہ دبی ہوئی۔ پسی ہوئی جنتا نہ جانے کب تک اپنی چھاتیاں پیش کرتی رہے گی!"

شاعر چپ تھا۔

یہ خواب تو نہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا ویری ناگ کے مغلئی کھنڈرات کے اس پار ... ان اندھے، بہرے گونگے کھنڈرات کے اس پار، بنگال ابا ہوا تھا۔ کوئی دوشیزہ اپنے محبوب کو بلا رہی تھی۔

— آدھی رات کو پھولوں کے جنگل میں درشن دیجیو رے بھونرے!
آدھی رات کو پھولوں کے جنگل میں درشن دیجیو۔
چاند کا دیا جلا کر رے
رات بھر میں جاگتی رہوں گی رے
اوس کی بوندوں سے باتیں کئے جاؤں گی، رے بھونرے!
آدھی رات کو پھولوں کے جنگل میں درشن دیجیو
اگر میں سو بھی جاؤں
سپنوں کے راستے پر چل پڑوں گی رے
چپ چاپ قدموں کے ساتھ درشن دیجیو
تمہارا گیت تھمنے نہ پائے
میری نیند ٹوٹنے نہ پائے
پھولوں کی نیند ٹوٹنے نہ پائے
آدھی رات کو پھولوں کے جنگل میں درشن دیجیو رے، بھونرے!
آدھی رات کو پھولوں کے جنگل میں درشن دیجیو

شاعر کہہ رہا تھا" بھونرے کا گیت تھمے گا نہیں اور پھولوں کے جنگل کی نیند بھی نہیں ٹوٹے گی" یہ طنز نگار بولا! "میاں نکلو اس بھول بھلیاں سے۔ زندگی

کی بے پناہ تلخیوں سے یوں چھٹکارا نہیں ملنے کا۔ وہاں زمین سنگلاخ ہے نا! اور یہاں خمار آلود خواب ہیں پگڈنڈیوں پر ریشم بچھ جاتا ہے۔ شاعر کہہ اٹھا "خدا کی قسم! بے بھوون اسے سن پاتا تو عش عش کر اٹھتا۔ یہ تم جانتے ہو کہ بے تھوون کو اپنی مشہور سمفنی کی بنیادی لے ایک لوک گیت سے حاصل ہوئی تھی۔" ... لیکن میں نے طنز نگار کی بات پسند کی۔ حقیقت پسندی کی سنگلاخ زمین مجھے بلا رہی تھی۔ شاعر نے گرم ہو کر کہا "مجھے چھوڑ کر تم کہیں نہ جا سکو گے۔ اپنا وعدہ یاد کرو۔" طنز نگار بھی جھنجھلایا۔ "میں جانتا ہوں تم اس عادی قیدی کی طرح ہو، جسے لاکھ کوئی جیل سے آزاد کرے مگر اس کے قدم گھوم پھر کر اسی جیل کے دروازے پر پہونچ جاتے ہیں۔"

چاروں طرف چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ سایوں کی اپنی جنتیت تھی۔ کوئلے کے انڈوں پر بھورے بھورے دھبوں کی طرح۔ معلوم ہوتا تھا رات لمبی ہوتی چلی جائے گی۔ شہزادی کی سو سالہ نیند کی طرح۔ شاعر کہہ رہا تھا "ابیل کا نغمہ مجھے اتنا ہی پیارا ہے جتنا ارنسٹ ٹالر کو وہ گھونسلا پیارا تھا جسے ایک ابابیل نے اس جیل کی کوٹھری میں بنایا، جہاں ٹالر پانچ برس تک قید رہا اور جس کی تصویر اس نے اپنی ایک مشہور نظم میں پیش کی ہے، طنز نگار بولا "تم نے صرف ٹالر کا نام سن رکھا ہے۔ تم اس افیمی کی طرح ہو، جسے نشہ چاہیے۔ چاہے وہ زہر ہی کیوں نہ ہو۔ تم نے سمجھا ٹالر کی ابابیل والی نظم بھی افیم کی گولی ہو گی۔ جسے تم ہتھیلی پر مل کر منہ میں ڈال لو گے اور ایک گھونٹ پانی کے ساتھ اسے نگل جاؤ گے۔ پھر ٹالر کا نام نہ لینا۔ ایک افیمی کیا جانے ٹالر کی قدر؟ ٹالر نے انقلاب کو زندہ زبان دی۔"

پھر راجپوتانہ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کوئی گوری اپنے گھوڑ سوار محبوب سے رکنے کی التجا کر رہی تھی۔"

ناگ جی! دو گھڑی کے لئے گھوڑا تھام لو رے
ارے بیری! آؤ تم پر گھونگھٹ کی چھاؤں کر دوں، ناگ جی!
ناگ جی! بھیانک دھوپ پڑ رہی ہے، ارے ہاں،
ارے بیری دھوپ نے مجھے گھائل کر دیا، ناگ جی!
ناگ جی! من لوبھی ہے، من لالچی ہے رے
ارے بیری من چنچل ہے، من چور ہے ناگ جی،
ناگ جی من کے پیچھے مت چلو رے
ارے بیری! پلک جھپکاتے ہی من اور کا اور ہو جاتا ہے، ناگ جی،
ناگ جی پریت کو یوں اچانک مت توڑ ڈالو رے
ارے بیری جیسے چرخہ کاتنے والی سوت کا تار توڑ ڈالتی ہے، ناگ جی!
ناگ جی ٹوٹنے کے فوراً بعد اسے جوڑ دو رے
ارے بیری! پریت تو کبھی پرائی نہیں ہو پاتی، ناگ جی!
ناگ جی تم نے خزانے مال خوب کھایا ہے رے
ارے بیری! تم نمک حرام ہوئے جاتے ہو، ناگ جی۔
ناگ جی! ایک گھوڑا موڑ لو رے،
ارے بیری میں من کی باتیں کروں گی، ناگ جی!

شاعر بولا! مجھے اس گیت کا وہ حصہ سب سے زیادہ پسند ہے، جہاں چرخہ کاتنے والی کے ہاتھ میں سوت کا تار ٹوٹنے اور جوڑنے سے عشق کو تشبیہ دی گئی ہے میں نے خود مارواڑنوں کی زبان سے بارہا یہ گیت سنا ہے۔" طنز نگار کہہ اٹھا، "اور سب سچ لیکن مارواڑیوں کے گانے کی بات جھوٹ۔"

خیال آیا کہ اٹھ کر ڈیرے کو چل دوں، شاعر اور طنز نگار دونوں سے چھٹی پاکر آرام سے سو جاؤں۔ لیکن اسے چاندنی رات کی سحر طرازی سمجھئے کہ میں وہاں جم کر بیٹھا رہا۔ ہلکی ہلکی گدگدی کی طرح اندور کا وہ لوک گیت میرے دل و دماغ کو سہلانے لگا جس میں ایک گوری اپنے بالم سے کہتی ہے۔ تم چل دو گے میں کھچڑی پکاؤں گی۔ رہ جاؤ تو کھیر پکاؤں گی۔ بالم کہتا ہے۔ تمہاری کھچڑی چکھ لوں گا اور تمہاری کھیر کھاؤں گا، پر مجھے جانا ہے ضرور۔ گوری کہتی ہے تم چل دو گے تو سپید ساری پہنوں گی۔ رہ جاؤ تو دلھن کی ساری پہنوں گی۔ بالم جواب دیتا ہے، تمہاری سپید ساری کو دیکھ لوں گا، تمہاری دلھن کی ساری کا رس لے لوں گا، پر مجھے جانا ہے ضرور۔ گوری کہتی ہے تم چل دو گے تو کمبل بچھاؤں گی۔ رہ جاؤ تو پھولوں کی سیج بچھاؤں گی۔ بالم جواب دیتا ہے تمہارے کمبل پہ بیٹھ کر دیکھ لوں گا۔ تمہاری پھولوں کی سیج کا رس لے لوں گا۔ پر مجھے جانا ہے ضرور۔

شاعر کہہ رہا تھا! "محبت کبھی نہیں مرتی" طنز نگار بولا "جس سے آدمی جتنی محبت کرتا ہے اس سے اتنی ہی نفرت بھی کرتا ہے۔ میں کہتا ہوں محبت سے کہیں زیادہ نفرت ہی کام کر رہی ہوتی ہے"

سوئی گھمائی جا چکی تھی، اب پنجاب سے آواز آ رہی تھی۔

— پوڑا کھانے کو جی چاہتا ہے اور میں نے آٹا گھول لیا

آٹا گھول لیا۔ پہلا پوڑا توے پر ڈالتی ہوں تو پڑوسن پوچھ تاچھ کرتی ہے
پڑوسن پوچھ تاچھ کرتی ہے۔ دوسرا پوڑا توے پر ڈالتی ہو تو ساس تاکنے لگتی ہے
ساس تاکنے لگتی ہے اسے گھٹنے تلے چھپاتی ہوں، تو گھٹنا جل گیا
گھٹنا جل گیا۔ پیڑھی کے نیچے چھپاتی ہوں تو پیڑھی ساس کی ہے۔

پیڑھی ساس کی ہے۔ کھاٹ کے نیچے چھپاتی ہوں تو کھاٹ جیٹھ کی ہے
کھاٹ جیٹھ کی ہے، اکھاری کے نیچے چھپاتی ہوں تو چوہے دیکھتے ہیں
چوہے دیکھتے ہیں اسے لئے ہوئے میں زینے پر چڑھ گئی تو ڈنڈا اڑک گیا
ڈنڈا اڑک گیا میں چھت پر چڑھ گئی۔ تو چیلیں منڈلاتی ہیں۔
چیلیں منڈلاتی ہیں۔ میں چوبارے میں چلی گئی تو شوہر آگیا۔
شوہر آگیا اس کے ہاتھ میں تازی لچکیلی چھڑیاں ہیں اور وہ مجھے پیٹتا ہے
مجھے پیٹتا ہے ساس کے من میں چاؤ ہے کہ بہو کو پیٹ ڈالا۔
بہو کو پیٹ ڈالا۔ اے پرائی بیٹی مر جائے گی اور تو برباد ہو جائے گا
طنز نگار بولا۔ میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آدمی جس سے جتنی محبت کرتا ہے، اس سے اتنی ہی نفرت بھی کرتا ہے۔ بلکہ محبت سے کہیں زیادہ نفرت ہی کام کر رہی ہوتی ہے۔"

شاعر بولا۔ "تمہاری بات پر غور کر رہا ہوں۔"

طنز نگار بولا۔ "عورت بھی عجیب بلا ہے۔ ان گنت صدیوں سے وہ مرد کے ہاتھوں پٹتی رہی ہے۔ پھر بھی وہ اسے محبت کئے جاتی ہے۔"

شاعر چپ تھا۔ اس کی حالت اس مداری کی سی تھی۔ جسے ہمیشہ کھوٹا پیسہ نصیب ہوتا ہو۔ اس وقت کرناٹک کی آواز سنائی دینے لگی!

مرے گاؤں کی قسمت جاگے۔ مرے یہاں بیج بوئے جائیں
مرے گاؤں کی پہاڑی سرسبز ہو جائے اور مجھ سی
عورت کا انصاف ہو جائے۔

اب طنز نگار کچھ نہ بولا۔ میں نے پھر سوئی گھما دی۔ یہ تامل ناڈ کی آواز تھی!

چاول ہے، دال ہے۔
چولھا نہیں، یہی دقت ہے
ہوا چل رہی ہے، گرد اڑتی ہے۔
کواڑ نہیں۔ یہی دقت ہے
بیوی آکر سامنے کھڑی ہے
ساری نہیں، یہی دقت ہے
فقیر آکر دروازے پر کھڑا ہے
ادھیلا نہیں۔ یہی دقت ہے

شاعر کی حالت اس گلہری کی سی تھی جو جنگل سے اخروٹ اٹھا اٹھا کر اپنے سوکھے میں جمع کرتی جائے۔ اسے خوش کرنے کے لئے ہیں نے گجرات کی آواز حاصل کی

کوئی مدھر جھنکار کرتی ہوئی، ہم ہیں گھنٹیاں
ہم منگل گان کرتی ہیں، مدھر گھنٹیاں
ہم سوتے دیوتا کو جگاتی ہیں — گھنٹیاں۔

طنز نگار بولا "اب بند بھی کردو یہ گھنٹیاں۔ یہ صرف دیوتاؤں کو جگا سکتی ہیں بھوکے انسانوں کی قسمت کو جگانا ان کے بس کی بات نہیں۔ کسی کی بیوی کو خودکشی سے روکنے کی طاقت ان میں کہاں؟ نہ یہ سر پراگاؤں کی عورت کا انصاف کر سکتی ہیں، نہ تامل ناڈ کی دقتوں کو دور کر سکتی ہیں۔"

بلبل کا نغمہ شاید ہمارے سوگیتوں پر بھاری تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ میری روح سے صدیوں کا بوجھ اتر گیا۔ لیکن شاعر بولا۔ "دیری ناگ گویا ایک بھوری بھینس ہے۔ جگالی کرتی ہوئی بھوری بھینس — اسے میری بھوک کی کیا فکر؟" اس کا دھیان

بدلنے کے لئے میں نے خود سوئی گھمادی، اڑیسہ کی قدیم النسل سورا قوم اپنا اجتماعی نغمہ چھیڑ رہی تھی۔

— ارے ہل ترے ہاتھوں کو نمسکار

ارے ہل ترے پیروں کو نمسکار

سال کے پیڑ کو سراہتا ہوں

جس سے تم بنائے گئے ہو

تم سدا بلوان رہو

تم سدا کام کے لئے تیار رہو

نہ جانے کتنی صدیوں سے یہ گیت گایا جارہا تھا۔ یہ گیت جس میں سورا جنتا نے اپنی روح تک سمودی۔ اس وقت مجھے دو لڑکیوں کا دھیان آیا۔ ایک نے گیت لکھانے سے تنگ آکر کہا تھا! "تم گیت پر گیت پوچھے جارہے ہو۔ یہ کیوں نہیں پوچھتے کہ گیہوں کا کیا بھاؤ ہو گیا؟" دوسری نے پتھر کوٹتے کوٹتے کہا تھا "میرا نام ہے روٹی کھاؤ پانی پیو" شاعر اپنا نام "نہ پھل نہ روٹی" بتاتا شاید طنز نگار کے پیش نظر اسے "گیت ہی گیت" کا لقب دیا جاسکتا تھا!

ٹمٹماتے دیے کی طرف دیکھتے ہوئے طنز نگار بولا "تیل کے بغیر تو دیا بھی نہیں جلتا کھانا کھائے بغیر شاعر نہ جانے کیسے گیتوں میں مگن رہ سکتا ہے"............. میں نے ایک شرابی کی طرح کہا — "لو ایک گھونٹ اور سہی" اور میں نے اب کے گلمرگ کی طرف سوئی گھمادی:۔

اپنے آغوش میں تجھے جھلاؤں گی۔ میرے کان کے آویزے امیر سکان گھما دیئے تم دلی کے شہزادے ہو، تم لاہور سے آئے ہو۔ لاہور سے آئے ہو،

تمہارے گلے میں بادام کی گریوں کا ہار ہے، تم چلتے ہو تو آواز آتی ہے، چلتے ہو تو آواز آتی ہے۔

پیروں کی انگلیوں کے سرے تو نہیں جل گئے۔ ارے مر کر راکھ ہونے والے، مر کر راکھ ہونے والے۔

بار بار میرے ہاں آؤ۔ ارے پاگل منصور، پاگل منصور،
میرے آنگن سے مت گزرو، بینگن چرانے والے، بینگن چرانے والے
تیرے لئے کیا پکاؤں؟ انڈے کا سالن؟ انڈے کا سالن؟
نقاب تو الٹ دیتی، پر یہ دستور نہیں، دستور نہیں،

بھو کا شاعر ہمہ تن گوش ہو گیا تھا۔ بہت خوبصورت نغمہ ہے، ترل رل، ترل، جیسے کوئی چشمہ گنگنا رہا ہو۔ سچ جانو! اس سے تو کچھ ایسی خوشبو آتی ہے جو تازہ کٹے ہوئے دیودار کی خوشبو سے بھی بڑھ کر ہے۔

میرا ذہن اچھا خاصا ریڈیو بن گیا تھا۔ ذرا سوئی گھمائی اور نغمہ بدل گیا۔ شاعر کی حالت کچھ اس شخص کی سی تھی جو محفل میں بیٹھا ہو۔ مگر پھر بھی اسے یہ احساس ہو کہ اس کے گرد تنہائی نے جال بن رکھا ہے۔ میں نے پھر سوئی گھما دی۔ ریڈیو بول رہا تھا یہ ویری ناگ ہے، ابھی آپ بلبل کا نغمہ سن رہے تھے۔ اب ایک کشمیری لوک گیت سنئے جس کے ٹیپ کے مصرعے کا مطلب ہے، کہ وہ ویریوں سے دھان کے پودے باندھ لیں...

... طنز نگار نے جھٹ سے سوئی پرے گھماتے ہوئے کہا؟ "ہندوستان غلام کا غلام ہے۔ تاریکی ہی تاریکی ہے، جہالت ہی جہالت، بھوک ہی بھوک، لہولہان دنیا کی لہولہان خبروں سے تمہاری طبیعت بہت پریشان رہتی ہے اور تم نے کہا تھا کہ جنگ سے پہلے ولیش میں بھیانک قحط آنے والا ہے، ہندوستان کے مسائل بھوتوں پریتوں

کی طرح میرے کانوں میں چیخنے لگے۔ شاعر نے چیخ کر کہا، لاکھ جنگ جاری رہے، لاکھ تاریکی ہو، جہالت ہو، غلامی ہو، نغمہ ہی حقیقت ہے، رقص ہی حقیقت ہے، رنگ ہی نغمہ ہے، نغمہ ہی رنگ ہے۔ گھبراؤ مت! نغمہ ہی آزادی ہے، نغمہ ہی آشا ہے۔ ... !"

میرا ریڈیو بول رہا تھا۔ یہ کلکتہ ہے، ابھی آپ نے دیپالی خاستگیر سے رابندر ناتھ ٹیگور کا گیت سنا۔ اب جے شری موجدار سے ایک بنگالی لوک گیت سنیے۔

ارے بھائی ناؤ کے ماجھی! سنو میں بتاؤں میرے دکھ کی کتھا سنو۔
کتنے ہی آدمی اور مویشی مر گئے جلیٹھ مہینے کے طوفان میں
ارے بھائی! جلیٹھ مہینے کے طوفان میں
تال کے پیڑ پر سالک پنچھی انڈے سے رہا ہے
او بھائی انڈے سے رہا ہے
میری بہو باپ کے گھر گئی ہے۔ اس کی پھوپھی مر گئی۔
ارے بھائی ناؤ کے ماجھی! سنو میں بتاؤں میرے دکھ کی کتھا سنو۔

شاعر اور طنز نگار خاموش تھے وسط ہند کے قدیم النسل گونڈوں کے ڈھول بجنے لگے اور ان کے کرما ناچ کا گیت گونج اٹھا۔

— میں نے تھالی بیچ دی لوٹا بیچ دیا اور گلے کا ہار بھی۔
اتنے پر بھی پورا قرضہ نہیں چکتا۔ جی گھبراتا ہے، پریتم!
اس منڈلا ضلع میں زندگی کٹھن ہو گئی، ہائے رے!

شاعر اور طنز نگار بدستور خاموش تھے۔ میں نے کہا "لوک گیتوں میں دیش کا صحیح حقیقی چہرہ نظر آتا ہے۔ یہ دیش کی اپنی آواز ہے۔ اپنی بیتی! ہر طرح کے تصنع سے بے نیاز۔"

شاعر بولا: "نئے دور کے پیش نظر نئے گیت جنم لے رہے ہیں۔ یہ جنگ کا زمانہ ہے۔ پنجاب کے "گدھا" ناچ میں آج کل عورتیں ایک نیا گیت گانے لگی ہیں — "آگے راہی راہ پچھدے، ہن پچھدے، لڑائی کتھے لگی؟" یعنی پہلے راہی راستہ پوچھتے تھے، اب وہ پوچھتے ہیں، جنگ کہاں چھڑ گئی؟"

طنز نگار نے شاعر کے اس بیان کی داد دی اور کہا کہ "تم ٹھیک کہتے ہو، تم نے وہ پنجابی گیت بھی تو سنا ہوگا۔ سرکاری ریل گاڑی پلوں کے اوپر سے گذر رہی ہے، ماؤں کے بیٹوں کو وہ بند کئے ہوئے لئے جا رہی ہے۔ یہ گیت بھی اسی جنگ کے زمانہ میں پیدا ہوا ہے۔ جب کہ روز ریل گاڑیوں میں ہزاروں نئے رنگروٹ اپنی اپنی چھاؤنیوں کو جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ ماں آخر ماں ہے، اسے تو بیٹوں کی جدائی زہر کا گھونٹ معلوم ہوتی ہے۔ اس بیچارگی میں وہ اپنے پیر کا آسرا لیتی ہے اور اس سے دعا کی درخواست کرتی ہے کہ اس کے لاڈلے بیٹے صحیح سلامت لوٹ کر گھر آئیں۔"

میں نے کہا: "لیکن نئے گیت کٹھالی میں پگھلتے سونے کی طرح ہیں۔"

ویری ناگ کی وہ رات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی، میرے سامنے ہندوستان کا نقشہ تھا — کسی دیو قامت کسان کے ہاتھ کی طرح۔ قسمت کی اچھی بری لکیروں کی طرح اس پر ان گنت پگڈنڈیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ جو پگڈنڈی مجھے ویری ناگ تک لے آئی تھی، اب گہرے گہرے سایوں میں چمک رہی تھی۔ جیسے یہ کسی اترائی ہوئی لجائی ہوئی دلہن کی مانگ ہو۔

شاعر بولا: "تمہارے پاؤں الجھے ہوئے راستوں کو سلجھا سکتے ہیں۔"

طنز نگار کہہ اٹھا: "لیکن شاعر، خود تمہارے ذہنی راستے اب تک

الجھے ہوئے تھے"

میں نے کہا "مرے ہمدم! مرے دوست! مرے شاعر! مرے طنز نگار! آپس میں یوں مت الجھو، لوک گیت زندہ باد۔ آؤ ہم مل کر نعرہ لگائیں۔

— "گائے جا ہندوستان!"

لال دھرتی

کوئی رنگ مظلوم نگاہوں کی طرح خاموش اور فریادی ہوتا ہے۔ کوئی رنگ خوبصورتی کی طرح کچھ کہتا ہوا اور داد طلب دکھائی دیتا ہے۔ کوئی رنگ مچلتا ہوا ہمیں کسی ضدی بچے کی یاد دلا جاتا ہے اور کسی کو دیکھ کر غنودگی سی چھا جاتی ہے ... لاری کے ڈرائیور نے دریا پار کرتے ہوئے کہا۔ "اب ہم آندھر دیش میں داخل ہو رہے ہیں بابوجی!" میں نے چاروں طرف پھیلی ہوئی سرخ زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آندھر دیش کی سرخ زمین کیا کہہ رہی ہے!"

آنکھیں موند کر میں نے اپنے دل میں جھانکا۔ وہاں سبز رنگ لہلہا رہا تھا۔ اپنے دماغ سے اس رنگ کا مطلب سمجھنے کی میں نے چنداں ضرورت نہ سمجھی اور آنکھیں کھول کر سرخ زمین کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ دھیرے دھیرے میں نے محسوس کیا کہ یہ رنگ بہت بلوان ہے اور میرا اپنا رنگ اس کے سامنے ٹک نہ سکے گا۔

ڈرائیور نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ایسا نظر آتا تھا کہ اس نے سرخ زمین کے بھید خود اس کی زبانی سن لئے ہیں اور اب اس کے لئے یہ مشکل ہو رہا ہے کہ انھیں چھپا کر رکھ سکے۔

لاری بھاگی جارہی تھی۔ سرخ دھول اڑا کر ڈرائیور کے گالوں پر اپنا رنگ چڑھا چکی تھی میں نے اپنے گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ یہ دھول وہاں بھی آجمی تھی۔ میں نے سوچا کہ میرے چہرے کی میل خوری زمین پر سرخ رنگ چڑھ گیا ہوگا اور بہت برا تو نہ لگتا ہوگا۔

"پہلے یہ سارا ضلع بہار اڑیسہ میں تھا، بابو جی!"

"اور اب؟"

"اب نقشہ بدل گیا ہے، بابو جی!"

"نقشہ بدل گیا ہے؟"

"جی ہاں۔ جب سے اڑیسہ الگ صوبہ بن گیا ہے، اس ضلع کے تیلگو بولنے والے حصے آندھر دیش کو مل گئے ہیں۔"

"بہت خوب!"

"لیکن ہم خوش ہیں، بابو جی! گورنمنٹ نے ابھی تک آندھر دیش کو الگ صوبہ بنانا منظور نہیں کیا۔"

"مگر کانگریس تو کبھی کی یہ قرارداد پاس کر چکی ہے کہ زبان کی اہمیت کو قبول کیا جائے۔ ہر بڑی زبان کا اپنا صوبہ ہو تاکہ ہر زبان کے ادب کی پوری پوری پرورش کی جاسکے، ہر تمدن اپنے اپنے ماحول میں آزاد ہو کر نشو و نما پاسکے،"

"جی ہاں۔ کانگریس نے یہی کہا ہے کہ آندھر دیش کا الگ صوبہ بنا دیا جائے مگر گورنمنٹ نہیں مانتی۔"

"گورنمنٹ کیوں نہیں مانتی؟ مدراس میں تو اب کانگریس منسٹری قائم ہو چکی ہے اور اس کے پردھان منتری راج گوپال آچاریہ بڑے زبردست آدمی ہیں۔ وہ یہ کام ضرور کر سکتے ہیں۔"

"مگر اس کا حکم تو لندن سے آنا چاہیے، بابو جی!"

"لندن سے؟"

"جی ہاں...... اور اگر یہ حکم نہ آیا تو ہم بڑی سے بڑی قربانی دیں گے اپنا لہو بہانے سے بھی گریز نہ کریں گے۔"

"لہو بہا دو گے اپنا؟ پہلے ہی یہ زمین کیا کم سرخ ہے؟"

ڈرائیور نے ایک بار پھر معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نیا رنگ جھانک رہا تھا۔ وہ نیا آدمی معلوم ہوتا تھا۔

زمین سرخ تھی۔ کبھی گہرا بادامی رنگ زور پکڑ لیتا۔ پھر یہ سیندوری بن جاتا ... سیندوری رنگ گلناری میں تبدیل ہو جاتا ....

سرخ رنگ مجھے جھنجھوڑ رہا تھا۔ میرے لہو کی روانی تیز ہو چکی تھی۔ کئی بڑے چھوٹے پلوں اور ننھی ننھی پلیوں کو پھاندتے ہوئے لاری دیجے نگرم کے قریب جا پہونچی۔ مندروں کے بڑے بڑے کلس دکھائی دینے لگے۔ اس بھاگم دوڑی میں ہمیں دیجے نگرم اپنی طرف بھاگتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ گویا ہماری لاری ساکن تھی۔

قصبے میں داخل ہوتے ہی سڑک ترمنی کی طرح تین طرف دوڑی جاتی تھی۔ دو سڑکوں کے سنگم پر بھیم راؤ کا مکان تھا۔ ڈرائیور انھیں پہچانتا تھا۔ ان کے گھر کے سامنے مجھے اتارتے ہوئے اس نے دوست نواز آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ "آندھر دیش کی سرخ زمین کیا کہہ رہی ہے؟" میں نے کہا۔ وہ مسکرایا۔ لاری آگے بڑھ گئی۔

میں نے آواز دی بھیم راؤ باہر نکلے۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کے آدمی تھے۔ چہرے پر سیتلا مائی کا آٹو گراف نظر آ رہا تھا۔ چیچک کے بڑے بڑے داغ! توند کی طرف دھیان گیا تو میں بڑی مشکل سے ہنسی کو روک سکا ہمارے اسکول میں ایسا ہیڈ ماسٹر کبھی

رعب قائم نہ رکھ سکتا

تعارفی چٹھی کو پڑھتے ہی وہ مجھے اندر لے گئے۔ بولے "آپ نے بہت اچھا کیا کہ اس غریب کے ہاں چلے آئے۔ اس چٹھی کی بھی کچھ ضرورت نہ تھی"

"آندھر دیش کی بہت تعریف سنی تھی" میں نے مسکرا کر کہا۔ بہت دنوں سے ادھر آنا چاہتا تھا"

"آپ شوق سے رہیے"

مجھے ایک الگ کمرہ مل گیا۔ فرش پر سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ ننگے پاؤں چلنے سے ہمیشہ یہ محسوس ہوتا کہ آندھر دیش کی سرخ زمین میرے پیروں سے چھو رہی ہے، اندر سے کمرے کا دروازہ بند کر کے کبھی کبھی میں قالین پر لیٹ جاتا اور دھیان سے اپنے دل کی دھڑکنیں سننے لگتا۔ اچھا شغل تھا۔ سرخ رنگ کیا کہہ رہا ہے؟ — بار بار یہ سوال زباں تک آیا مگر ہونٹ بند رہے۔

بھیم راؤ کے مکان پر کانگرس کا ترنگا جھنڈا لہرا رہا تھا... ... سبز اور سفید اور سرخ ... ... اس ترنگے جھنڈے کا مفہوم میرے ذہن میں اجاگر ہو اٹھا۔ دل ہی تو تھا، بیچ بیچ میں یہ کہنے لگتا کہ اس جھنڈے کا سرخ رنگ آندھر دیش کی ترجمانی کر رہا ہے اور یہ خیال آتے ہی مجھے ایک ناقابل بیان مسرت حاصل ہوئی۔ جہاں سفید رنگ ختم ہو کر سرخ رنگ شروع ہوتا تھا۔ وہیں میری نگاہ جم جاتی اور اس نوجوان لاری ڈرائیور کے الفاظ میرے کانوں میں گونج اٹھتے۔ "اب ہم آندھر دیش میں داخل ہو رہے ہیں، بابوجی"

میرے کمرے میں بڑا مختصر سا فرنیچر تھا۔ ایک طرف ایک ٹائلٹ میز پڑا ہوا تھا۔ دو کرسیاں، ایک تپائی اور ایک طرف ایک تخت جس پر مجھے سونا ہوتا تھا، بستر پر دن کے وقت کھادی کی دودھیا سفید چادر بچھا دی جاتی تھی۔ اب سوچتا ہوں کہ اس ٹائلٹ میز کا گول آئینہ وہاں نہ ہوتا تو وہ چند ہفتے اتنے دلچسپ نہ ہو جاتے۔ میرے جذبات کا رنگ کچا ہوئی

اینٹوں کی طرح سرخ ہو چلا تھا۔ یہ رنگ میرے چہرے پر بھی تھرک اٹھتا۔ اس کے لئے میں آئینے کا ممنون تھا۔

میرے کمرے کی دائیں کھڑکی میدان کی طرف کھلتی تھی۔ وہاں سبز گھاس اگتی ہوئی نظر آتی۔ پانی نہ ملنے پر یہ گھاس پیلی ہو سکتی تھی سرخ نہیں۔

دن چڑھتا اور پتہ ہی نہ چلتا کہ کیسے بیت گیا۔ وجے نگرم میرے لئے نیا تھا ہر آنکھ میں کوئی نہ کوئی صدیوں کا جمع شدہ رنگ تھرک اٹھتا۔ اس سے پہلے کہیں ماضی اور حال کو یوں بغلگیر ہوتے نہ دیکھا تھا۔ رات ختم ہوتی تو صبح سورج کا تمتماتا ہوا تلک لگائے آ حاضر ہونا اسے دیکھکر مجھے کرشنا دیبی کی پیشانی کا "بوٹو" یاد آجاتا۔

پیچھے سے آکر کرشنا دیبی میری آنکھیں بند کر لیتی۔ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑتی اور جوں ہی پرے ہٹتی۔ میری آنکھیں اس کی پیشانی کی طرف لپکتیں کم کم کا سرخ "بوٹو" کینڈل کی بجائے پچاس کینڈل کا برقی قمقمہ بن کر اس کی پیشانی کو روشن کرتا دکھائی دیتا۔ کوشش کرنے پر بھی میں کبھی اسے ایسی حالت میں نہ دیکھ سکا۔ جبکہ غسل کے بعد یہ "بوٹو" ڈھل کر اتر چکا ہو۔ پھر میں نے یہ کوشش چھوڑ دی۔ بس ٹھیک ہے یہ قمقمہ ہمیشہ روشن رہے، دن ہو چاہے رات — کم کم کا سرخ بوٹو!

ان پورنا اور کرشنا دیبی دونوں بہنیں تھیں۔ دیبی پورنا سے دو سال چھوٹی تھی۔ دونوں گھر پر پڑھتی تھیں۔ بڑی بہن سنگیت کی ابتدائی منزلوں کو طے کر کے اس کی گہرائیوں میں پہنچ چکی تھی۔ چھوٹی بہن صرف بہن کی وینا کو دیکھ چھوڑتی تھی۔ اس کا گانا سن لیتی تھی اور اگر اس نغمہ نے اس کی فطانت کا کوئی سویا ہوا رنگ جگا دیا تو اس نے تھوڑی بہت تک بندی کر لی۔ نہیں تو کس کی دینا، کون ان پورنا، وہ اپنی کتابوں میں الجھی رہتی بھیم راؤ اپنی بیٹیوں کی تعریف میرے سامنے بھی لے بیٹھتے۔ دونوں کے

سرخ "بوٹو" میرے ذہن میں تیرنے لگتے اور مجھے محسوس ہوتا کہ میرے منہ میں پان کی پیک اور بھی سرخ ہو گئی ہے۔ میرے جذبات چھالیہ کے ننھے باریک ریزے بن جاتے جو پان چباتے وقت پس سے دانتوں کی درزوں میں سے گزر جاتے ہیں۔

"یہ تو اپنے آدمی ہیں، بیٹیو!" بھیم راؤ کہتے، "ان سے خوب باتیں کرو، ان کی کہانیاں سنو۔ دیس دیس کا پانی پی رکھا ہے انھوں نے ـــ ہاں دیس دیس کا" اپنی یہ تعریف سن کر میرے ہر مسام کے کان اگ جاتے، ہونٹوں میں ایک عجیب سا تناؤ پیدا ہو جاتا، ذہن میں ایک گدگدی سی ہونے لگتی، یہ آندھر دیش کی سرخ زمین کا خلوص تھا ایک ترقی پسند خلوص!

"یہ کرشنا دیبی تو نری گلہری ہے مسٹر راؤ" ایک دن میں نے دونوں بہنوں کی موجودگی میں کہا، "اور یہ اچھا ہی ہے"

خوب! خوب! اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر، نچلی تو بیٹھ ہی نہیں سکتی گلہری ہی تو ہے۔

کرشنا دیبی ہنسی نہیں۔ آخر اس میں گلہری کی کیا بات ہے؟ شاید ہمارے معزز مہمان کے دیش میں کنیائیں گلہریاں نہیں ہوتیں۔ وہ حیا سے سمٹی رہتی ہوں گی۔ لیکن دیس دیس میں دھرتی دھرتی میں فرق ہوتا ہے نا

بھیم راؤ بولے "یہ آندھر دیش ہے۔"

انّ پورنا نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا "اور یہاں کی کنیائیں آزاد نظمیں بن گئی ہیں ـــ"

کرشنا دیبی کی آنکھوں میں ایک بجلی سی چمک گئی۔ بولی "جی ہاں آزاد نظمیں" اور میں نے محسوس کیا کہ کم از کم کرشنا دیبی ضرور ایک آزاد نظم ہے، نہ بحر

کی حاجتمند، نہ قافیے کی پابند۔

انّ پورنا نے اپنے بازو کرشنا دیبی کے بازوؤں پر ڈال دیے اور بولی دیبی! چلو آج دشیشری کے ہاں چلیں۔ کل تو آئی تھی ادھر۔ آج اس نے شکل ہی نہیں دکھائی۔

کرشنا دیبی نے اپنا چھوٹا سا خوبصورت سر ہلا دیا۔ اور پنکھے کی ڈنڈی کو قالین پر پھیرتے ہوئے بولی۔ "انّ پورنا میں باہر نہیں جا سکتی۔"

"کیوں نہیں جا سکتی باہر؟" ان پورنا نے حیران ہو کر پوچھا

دیبی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے ان پورنا کے گلے میں بازو ڈال دیے، بولی "دی دی ے" اور اس کے بعد اس کے کان میں کچھ کہہ گئی۔ ان پورنا اچھل پڑی۔ بولی۔ "سچ"

دیبی نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ میرا دل زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑایا۔ دیبی اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور غسل خانے کی طرف چل دی۔ ان پورنا نے تالی بجائی اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ اس وقت صبح کے دس بجے تھے۔ وہ بھی اپنی کھڑاؤں پر گھوم گئی اور سامنے رسوئی کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی جہاں اماں بیٹھی ہوئی زمین قند چھیل رہی تھی۔

انّ پورنا نے کہا "اماں ـــ"

اماں نے سر ہلا دیا۔ انّ پورنا اس کے قریب پہنچ کر جھک گئی اور اس کے کان میں کچھ کہہ دیا۔ اماں کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس کے گالوں پر ایک تمتماتی ہوئی سرخی نمودار ہوئی۔ پھر ایک مسکراہٹ ناچتی ہوئی اس کے چوڑے چکلے چہرے پر چوگان کھیلنے لگی۔ اماں نے چاقو اور زمین قند کو ایک طرف رکھ دیا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ بولی۔ "پنتلو گارو (پنڈت جی)!"

میرے لئے یہ سب ایک پہیلی سے بڑھ کر تھا۔ میرا خیال تھا کہ بھیم راؤ اس سے

کو رہے ہیں۔ وہ اٹھ کر اپنی بیوی کے پاس چلے گئے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں ریل گاڑی میں
بیٹھا ہوں جو دندناتی ہوئی ایک سرنگ میں سے گذر رہی ہے۔ گھپ اندھیرا چھا گیا ہے
. . . . کوئی عورتوں کی بات ہوگی۔ یہ سوچتے ہی سرنگ ختم ہو گئی۔

کرشنا دیبی نے پہلے کبھی وہ سبز رنگ کی ہلکی گھگھری نہ پہنی تھی۔ گھگھری کا رنگ
گہرا سبز تھا اور انگیا کا پھیکا سبز۔ اس کی آنکھوں کی جھیلوں میں بھی سبز رنگ کا عکس پڑ
رہا تھا۔ یہ رنگ کیا کہہ رہا ہے۔ یہ سوال مجھے اس سے ضرور کرنا چاہیے تھا۔ اس کے لہو میں
کسی نے سونا پگھلا کر ڈال دیا تھا؟ یہ سونا ہی تو تھا جو اس کے گالوں پر دمک رہا تھا۔ یہ سونا
کیا کہہ رہا تھا؟ مانگ کیا تھی۔ پوری پوری پگڈنڈی تھی۔ کیا مجال کوئی لٹ پھسل جائے۔ کوئی
بال سرک جائے۔ کنگھی چوٹی کا فن جوانی کے ساتھ ساتھ اپنے کمال کو پہونچتا ہے۔ ناک کی
سیدھ رکھ کر سر کے بیچوں بیچ مانگ کاڑھنا ان پورنا کو سرے سے ناپسند تھا۔ مگر نہیں
کرشنا دیبی کی سیدھی مانگ ان پورنا کی ٹیڑھی مانگ سے کہیں سندر لگتی تھی۔ اس وقت
دونوں بہنیں میرے قریب بیٹھی ہوتیں تو میں اپنا ووٹ چھوٹی بہن کے حق میں دیتا۔

کوئی ایک گھنٹہ بعد پورے گیارہ بجے اندر سے وینا کے سر سنائی دیے۔ صرف
ان پورنا ہی کی وینا تو یہ رنگ نہیں جما سکتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ محلے بھر کی وینا بجانے والی
سہیلیاں سُر میں سُر ملا کر کوئی راگ سادھ رہی ہیں۔ ایسی بھی کیا خوشی تھی؟

بہت سی عورتیں اور لڑکیاں جن کا ٹھٹھا اور ہنسی مذاق ہوا کو چیرے ڈالتا تھا آخر
کس تقریب پر بلائی گئی تھیں؟ مجھ سے نہ رہا گیا۔ بائیں کھڑکی کا پردہ ذرا سرکا کر میں نے آنگن
کی طرف نظر ڈالی تو کیا دیکھتا ہوں کہ کرشنا دیبی سامنے والے کمرے میں پیلی دھوتی پہنے
بیٹھی ہے اور آرتی اتاری جا رہی ہے۔ تھال بس کم کم نظر آ رہا تھا۔ لیکن اس میں کوئی چومکھا
دیا نہیں جلایا گیا تھا۔ کرشنا دیبی نے آنکھیں جھکا رکھی تھیں۔ اتنی بھی کیا لاج تھی؟ یہ کیا

کوئی دیوی بننے کا اپائے تھا۔

کرشنا دیبی کی ماں کو بدھائیاں مل رہی تھیں۔ ان پورنا کی وینا سب سے زیادہ چہک رہی تھی۔ رنگا رنگ کی ساڑھیاں میرے ذہن میں خلط ملط ہو رہی تھیں۔ ابھی ایک بچی رونے لگی۔ اسے ایک کیلا مل گیا۔ ادھر ایک لڑکی اپنے چھوٹے بھائی کے منہ میں گڑ اور تلوں کا لڈو ڈالنے لگی کہ ایک لڑکا اچک کر اسے چھین لے گیا۔ کچھ پروا نہیں لڈوؤں کی کیا کمی ہے؟ بھائی خوش رہے۔ جیتا رہے ... ... میری فطرت کے ایک پر اسرار کونے میں کوئی تان سین جاگ اٹھا جب ان پورنا نے اپنے گیت کی لہروں پر اٹھا لیا۔ یہ کیسا گیت تھا؟ شاید یہ دودھ اور شہد کا گیت تھا۔ دودھ دوہتے وقت جو آواز پیدا ہوتی ہے کچھ ایسی ہی آواز ان پورنا کی وینا پر پیدا ہوئی تھی۔

"اب تم گاؤ دستیشری"

"تم سا اچھا تو نہ گا سکوں گی۔ ان پورنا! اچھا بتاؤ کونسا گیت گاؤں؟"

وہی جو تم نے اس روز گایا تھا جب دینی کی طرح میں نے پیلی دھوتی پہنی تھی اور اسی طرح اسی آنگن میں ــــ برکت والے آنگن میں، عورتیں اور لڑکیاں جمع ہوئی تھیں ــــ وہی شہد کی مکھیوں والا گیت"

دستیشری نے گانا شروع کیا۔ آندھر دیش کی شہد کی مکھیاں کیا کہہ رہی ہیں یہ سوال میرے ذہن کی چار دیواری ہی میں بند رہا۔ وینا کے سر آگے بڑھتے گئے۔ یہ کوئی معمولی گیت نہ تھا۔ صدیوں کی نسوانیت کا جذبۂ برتری تھا۔ ابھی تو دوپہر تھی۔ لیکن ہر عورت اور لڑکی کی پیشانی پر ایک ایک چاند نظر آ رہا تھا۔ کم کم کے سرخ بوٹو!

کرشنا دیبی کی آنکھیں اوپر نہ اٹھیں۔ کیا یہ وہی لڑکی تھی ــ جو اب تک کبھی اپنی چوکڑی نہ بھولی تھی۔ اس کے آویزے ساکن تھے۔ اس کے نگینے چپ

تھے۔ لاج اور دوشیزگی پہلے تو کبھی یوں توام بہنوں کے روپ میں نظر نہ آئی تھیں۔ مگر وہ کوئی کبوتری تو نہ تھی جسے پہلی بار انڈے سینے سے سابقہ پڑا ہو۔

ٹھٹھا اور ہنسی مذاق خاموشی میں بدلتے گئے۔ گیت بھی کافی ہو چکے تھے۔ وناؤں کے تار تھک گئے تھے۔ کرشنا دیبی کی ماں اور بہن نے کم کم کی تھالیاں اٹھا کر ہر کسی کی پیشانی پر پھر سے نئے بوٹو لگا دئے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ پہلے لگے ہوئے بوٹو ہی جلی کر دئے گئے ایسا دن تو بہت مبارک تھا۔ ہر کسی کو پان پیش کیا گیا۔ ناریل اور کیلے تقسیم کئے گئے اور یوں سب کو وداع کیا گیا۔ صدیوں سے یوں ہی ہوتا آیا تھا کم کم کے سرخ بوٹو ان گنت نسلوں سے قائم رہے تھے۔ ان کا رنگ کبھی پھیکا پڑنے نہیں دیا جائے گا۔

دوسرے روز یہ محفل شام کے قریب جمی۔ پھر تیسرے روز بھی شام ہی کو۔ چوتھے دن شام کی بجائے صبح ہی کو یہ رونق شروع ہو گئی۔ اس اثنا میں مجھے پتہ چل چکا تھا کہ کرشنا دیبی رجسولا (حائضہ) ہو گئی ہے۔ مجھے حیرت ضرور ہوئی۔ کیونکہ اس سے پہلے ہندوستان میں کوئی ایسی رسم میرے دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔

بھیم راؤ کی باتوں میں میناکاری کا رنگ پیدا ہو گیا تھا۔ بولے:۔ جھوٹی شرم میں آندھرا دیش کوئی وشواش نہیں رکھتا۔ سچ کہتا ہوں مجھے تو حیرانی ہے یہ سن کر کہ آپ کے ہاں ایسی کوئی رسم منائی نہیں جاتی۔"

"جی ہاں حیرانی تو ہونی ہی چاہئے"، میں نے بڑھاوا دیا۔

"کتنا فرق ہے دھرتی دھرتی کا"

"یہ تو ظاہر ہے۔"

"رجسولا ہونے پر گویا کنیا کو قدرت کا آشیرباد ملتا ہے۔"

"آپ کا مطمح نظر بالکل ٹھیک ہے مسٹر راؤ اور ایسے موقع پر خوشی

منانے سے ہرگز نہ چوکنا چاہیے۔"

"ہمارے یہ گیت آپ کو کیسے لگتے ہیں؟"

"یہ سب گیت، وینا کے یہ سُر آندھر دیش کے ابدی بول معلوم ہوتے ہیں۔"

آندھر دیش کے ابدی بول! ہماری یہ رسم بہت پرانی ہے۔"

"ضرور پرانی ہوگی۔"

پہلے روز جب کنیا کو اپنے رجسولا ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح فوراً ماں تک یہ خبر پہنچا دیتی ہے۔ تین دن تک اسے ہلدی کے پانی میں رنگی ہوئی دھوتی پہن کر الگ کمرے میں بیٹھنا ہوتا ہے۔ کوئی اسے چھوئے گا نہیں۔ اس کی آرتی بھی دور ہی سے اتاری جاتی ہے۔

"آرتی میں ہمارے یہاں جلتا ہوا دیا۔ چونکہ دیا نہ بھی ہو تو پروا نہیں ضروری سمجھا جاتا ہے۔ مگر آپ کے ہاں ۔"

فرق تو ہوتا ہی۔ دھرتی دھرتی کا۔ ہمارے ہاں بس کم کم ہی سب سے ضروری مان لیا گیا ہے آرتی کے لئے؟"

"سرخ کم کم؟"

"کم کم ہمیشہ سرخ ہی ہوتا ہے۔"

میں نے مسکرا کر آنکھیں جھکا لیں۔ بھیم راؤ نے اپنی بات جاری رکھی۔ کھانے میں بھی رجسولا کو کافی پرہیز کرنا ہوتا ہے۔

سرخ مرچ اور گرم مسالے اس کے لئے منع ہیں۔ بیٹھے بٹھائے اسے کھچڑی دودھ اور کچھ پھل مل جاتے ہیں۔ کھائے اور پورا آرام کرے۔ یہ ضروری ہے۔"

"تین دن کے بعد کیا ہوتا ہے؟" میں نے پھر بڑھا دیا۔

"کنیا اشنان کر کے پوتر ہو جایا کرتی ہے اس کی وہ پہلی دھوتی دھوبن کو بطور تحفے کے دے دی جاتی ہے۔ اب وہ ماتا پتا کی حیثیت کے مطابق نئے وستر پہن کر بیٹھتی ہے اور یہ چوتھی یعنی آخری آرتی اتارتے وقت اس کی پیشانی پر بوٹو لگایا جاتا ہے!"

"بوٹو کے لئے کم کم نہ ہو تو آندھر دیش کا کام ہی نہ چل سکے۔ مسٹر راؤ!"

"کم کم؟ یہ تو ضروری ہے۔"

"بلکہ یہ کہئے کہ آندھر دیش اور کم کم دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔"

"بس اب آپ نے ٹھیک سمجھ لی ہے بات۔"

"میرا رجحان شروع سے سبز رنگ کی طرف رہا ہے، مسٹر راؤ!"

"سبز رنگ کی طرف؟ لیکن سرخ رنگ نرالی زبان میں بولتا ہے... کم کم کا پیغام آندھر دیش صدیوں سے سنتا آیا ہے۔"

رنگوں کا مطالعہ میں نے بھی کر رکھا ہے، مسٹر راؤ! سبز رنگ اپنی جگہ ہے یہ شانتی کا رنگ ہے۔ ہر سبز چیز امن و سکون کا اشارہ کرتی ہے۔ قدرت کو شاید یہی رنگ سب سے زیادہ پسند ہے۔ جب تک دھرتی بنجر نہیں ہو جاتی۔ اس کی کوکھ سے اس رنگ کے کارنامے ہمیشہ ہمارا دھیان کھینچتے رہیں گے۔ کانگرس نے بہت اچھا کیا کہ اپنے جھنڈے پر اس رنگ کو اس کی جگہ دینے کی بات فراموش نہ کی۔ سفید رنگ میرے خیال میں پوترتا (پاکیزگی) کا رنگ ہے۔ ہمارے جھنڈے پر بھی یہ رنگ بھی موجود ہے اور سرخ رنگ؟ میں سمجھتا ہوں یہ خون کا رنگ ہے۔ اچھے تندرست خون کا رنگ۔ تازہ مضبوط زندگی کا رنگ ... ... سبز۔ سفید۔ سرخ۔ خوب رنگ چنے ہیں۔ کانگرس نے یہ جھنڈا بنانے کا کام آندھر دیش کے سپرد کیا جاتا تو سارے جھنڈے پر کم کم ہی کم کم پھیل جاتا۔"

"لیکن یاد رہے کہ سرخ رنگ کا مفہوم سمجھنے میں آندھر دیش نے خوب قدم بڑھایا ہے . . . کانگریس کے بائیں ہاتھ نے ادھر جو زور پکڑا ہے۔ وہ بھی ظاہر ہے۔ پچھلے دنوں جب شری سبھاش چندر بوس کانگریس پریدھان کے انتخاب میں دوبارہ کھڑے ہوئے تو آندھر دیش کے ووٹ بہت بھاری تعداد میں انھیں کو ملے تھے۔ حالانکہ ان کے مقابلے پر کھڑے ہونے والے ڈاکٹر پٹابھی سیتارامیا آندھر دیش کے اپنے آدمی ہیں مگر آپ جانتے ہیں ان باتوں میں لحاظ داری تو ٹھیک نہیں ہوتی۔ سوشلزم اور ہندستان کی آزادی ہمارے دو بڑے آدرش ہیں اور آندھر دیش کو الگ صوبے کا وقار حاصل ہو جائے۔ اس کے لئے ہم اپنی جانیں لڑانے پر آمادہ ہیں۔"

"پنتلو گارو (پنڈت جی!) باہر سے کسی نے آواز دی۔

بھیم راؤ باہر چلے گئے۔ میں کھڑکی میں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ یوں محسوس ہوا کہ کسی کے غیر مرئی ہاتھ میری پیشانی پر کم کم کا بوٹو لگا رہے ہیں۔ میں جھٹ وہاں سے ہٹ گیا اور کمرے کو اندر سے بند کر کے میں نے بائیں کھڑکی کا پردہ ہولے ہولے ایک کونے سے سرکایا۔ سامنے بڑی خوشنما محفل نظر آ رہی تھی۔ کرشنا دیبی نے ہلکے نیلے انگیا کے ساتھ گہری نیلی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ آویزوں کے نگینے سردئی تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے ذہن کے بچے کھچے سبز رنگ نے ان رنگینیوں میں پناہ پائی ہے۔

ان پورنا نے وینا پر ملہار کا راگ شروع کیا۔ اس کی انگلیاں بہت ہمک ہمک کر چل رہی تھیں۔ مگر اس راگ سے بھی کرشنا دیبی کی آنکھیں اوپر نہ اٹھیں۔ ان پورنا آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی اور کرشنا دیبی دھرتی کی طرف آنکھیں جھکائے بیٹھی تھی۔ کس نے چھو دیا تھا اپنے غیر مرئی باغی ہاتھ سے اس کنیا کو؟ . . . ہر رجسولا تو یوں چھوئی موئی بن کر نہ رہ جاتی ہوگی . . . ہلکی نیلی انگیا۔ گہری

نیلی ساڑھی اور آویزوں کے سرد نگینے! ... ... باہر سے تازہ ہوا کا جھونکا آرہا تھا۔

بہت ہو چکی یہ لاج دیئی "ان پورنا بولی" میں بھی ہوئی تھی۔ رجسو لا تیری طرح۔ میں نے تو پہلے ہی روز کے بعد مسکرانا شروع کر دیا تھا، اوپر دائیں بائیں، سامنے دیکھنا شروع کر دیا تھا"

"میں تو کبھی نہیں ستاتی کسی کو"

کرشنا دیئی کے چہرے پر ہولے ہولے وہی پرانی شوخی آتی گئی۔ اماں نے آگے بڑھ کر کم اٹھایا اور اس کے لوٹے کو جلی کر دیا۔

کرشنا دیئی اب کوئی چھوٹی موئی نہ تھی۔ ہر چہرے کی طرف اس کی آنکھیں اٹھ جاتی تھیں۔ کالی چھیلوں میں نہ جانے کتنی لہریں بھڑک رہی تھیں ... ... کرشنا دیئی کے صندلی بازو جنھیں دیکھ کر تازہ تازہ رندہ کئے جانے کا گمان ہوتا تھا۔ اوپر اٹھا اور اس نے سب کو نمسکار کیا۔

سب عورتیں اور لڑکیاں مسکرائیں۔ سب کے رخ بو ٹو نازے کم سے جلی کر دئے گئے۔ جانے کیا کہہ رہی تھیں۔ کاجل کی لکیریں ہر آنکھ میں؟ ... ... پان بیٹے — سبزیاں، جو اپنے سینوں میں سرخ رنگ چھپائے پڑے تھے، کیلے کے ٹہنیلے بٹے۔ سب اٹھ کھڑی ہو گئیں ... ... کیا رنگیں تھیں یہ ساڑھیاں؟ کیا سرخ تھی یہ زمین؟ — اس کے خط، اس کی قوسیں، ہونٹ، گال، آنکھیں سینے؟ کون فنکار ان کی تخلیق کرتا تھا؟ کون تھا جو زمین کی ہر بیٹی کو ٹھیک وقت پر رجسو لا بنا دیتا تھا؟ ... ... یہ تو بہت ضروری تھا۔ ان گنت صدیوں سے، سبز سفید اور سرخ صدیوں سے یہی ہوتا آیا تھا۔

سب عورتیں چلی گئیں۔ سب لڑکیاں بھی تتر بتر ہو کر اپنے اپنے گھر بھاگ گئیں
اب صرف کرشنا دیدی اور آن پورنا رہ گئیں۔ اماں رسوئی میں جا چکی تھی۔
"اچھا پورنا ایک بات بتاؤ گی؟"

"پوچھو پوچھو"
رجسولا ہو کر بھی میں اتنی کمزور نہیں ہوئی۔ بھلا کیسے؟
"کیسے؟ یہی ہوتا آیا ہے بہن شروع دنیا سے، ہیں کون سی کمزور ہو گئی تھی؟
بلکہ رنگ نکھر جاتا ہے، اس سے ... ... پھر ... ... ہر مہینے!
ہر مہینے؟
"چپ دیدی کوئی سن لے گا"
پھر دونوں بہنیں اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ میں اپنے سرخ قالین پر لیٹ گیا۔ میری روح کی
گہرائیوں سے ایک خیال اٹھا، اور باہر سے آنے والی ہوا کے جھونکے سے ٹکرا گیا۔
میرے ذہن میں کانگریس کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ سبز، سفید اور سرخ ـــ اس جھنڈے
کی عمر بہت زیادہ تو نہ تھی۔ مگر یہ رنگ تو پرانے تھے۔ ہمالہ کے ہم عمر رنگ، گنگا، برہم پتر اور
گوداوری کے ہم عمر رنگ! ہو گا ان رنگوں کا اپنا اپنا مفہوم۔ مگر میں تو اس مفہوم پر لٹو تھا جو خود
ہندوستان نے ان رنگوں کے ساتھ وابستہ کر دیا تھا ... ... اور میری آنکھوں میں وہی
لاری پھرنے لگی، جس پر سوار ہو کر میں بھیم راؤ کے مکان تک پہنچا تھا۔
دائیں بائیں آمنے سامنے۔ جہاں تک میرے ذہن کی پہونچ تھی۔ سرخ زمین لیٹی
ہوئی تھی۔ ایک رجسولا کنیا کی طرح وہ آرام کر رہی تھی۔ وہ وقت مجھے بہت قریب آتا دکھائی دیا
جب اس کی کوکھ ہری ہو گی اور کوئی ایسا آدمی پیدا ہو گا جو بہ آواز بلند پکار اٹھے گا۔ ہلوں کی
جے۔ اب ان کھیتوں میں غلام نہیں اگیں گے۔ یہ لال دھرتی ہے۔